اِس شمارے میں شامل مضامین، تنقیدی رائے یا شعری وفکری خیال سے اِدارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

ادارے کی اٹھائیسویں پیش کش

سہ ماہی

کینیڈا

فروغِ مرثیہ

نومبر ۲۰۲۳ء بمطابق ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ

ایڈیٹر

اصغر مہدی اشعر

جملہ حقوق بحقِ فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل محفوظ ہیں

عنوان	:	فروغِ مرثیہ (چودھواں شمارہ)
اشاعت	:	نومبر ۲۰۲۳ء
تعدادِ اشاعت	:	۵۰۰
ایڈیٹر	:	اصغر مہدی اشعر
ناشر	:	فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل، کینیڈا
طابع	:	RB پرنٹرز اینڈ پبلشرز، کراچی
قیمت فی شمارہ	:	۱۵ر ڈالر، ۱۰ر پونڈ
ای میل	:	faroghemarsiya@gmail.com
فون	:	+1-905-462-9211
پتہ	:	441 JELINIK TERRACE, MILTON ONTARIO, CANADA L9T7N2

فروغِ مرثیہ

سہ ماہی

کینیڈا

ترتیب

۱۔اداریہ	اصغر مہدی اشعر (کینیڈا)	۴
۲۔سلام	رضیؔ جعفری (کینیڈا)	۶
۳۔سلام	عشرتؔ آفریں (امریکہ)	۷
۴۔سلام	کلیمؔ ظفر (کینیڈا)	۸
۵۔سلام	احمر شہوارؔ (امریکہ)	۹
۶۔سلام	ڈاکٹر جاوید منظرؔ (پاکستان)	۱۰
۷۔سلام	جوہرؔ عباس (پاکستان)	۱۱
۸۔سلام	وفاؔ نقوی (انڈیا)، حسن رضوی حرؔ (یو اے ای)	۱۲
۹۔سلام	پروینؔ حیدر (پاکستان)	۱۳
۱۱۔غیر مطبوعہ مرثیہ ''کربلا''	عابدؔ جعفری (کینیڈا)	۱۴
۱۲۔میر انیسؔ کی تخلیقی صلاحیت کا تجزیہ کیسے ہو؟	ڈاکٹر تمثال مسعود (امریکہ)	۲۰
۱۳۔غیر مطبوعہ مرثیہ ''اسیری''	فدا محمد ناشادؔ (پاکستان)	۲۵
۱۴۔سلام نگاری کلامِ نفیسؔ کے آئینے میں	مولانا دلکشؔ غازی پوری (انڈیا)	۳۴
۱۵۔غیر مطبوعہ مرثیہ ''اسم''	محمد علی ظاہرؔ (پاکستان)	۴۵
۱۶۔انوارِ کسا کی مضطر شعاعیں	پروفیسر ناشرؔ نقوی (انڈیا)	۵۴
۱۷۔ساحرؔ لکھنوی کے چند قلمی آثار	سیّد ضمیر حیدر (پاکستان)	۵۶
۱۸۔غیر مطبوعہ مرثیہ ''قیامت''	علی عرفانؔ (کینیڈا)	۶۵
۱۹۔''اُردو مرثیے میں نعتیہ عناصر'' ایک روشن نصاب	عادلؔ مختار (پاکستان)	۶۹
۲۰۔سرتاجؔ کی مرثیہ نگاری	علی عرفانؔ (کینیڈا)	۷۳
۲۱۔غیر مطبوعہ مرثیہ	شگفتہؔ دلشاد (پاکستان)	۷۷
۲۲۔ایڈیٹر کے نام خط	پروفیسر ناشرؔ نقوی (انڈیا)، فدا حسین کاظم (پاکستان)	۸۰

اداریہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فروغِ مرثیہ کا چودھواں شمارہ پیشِ نظر ہے۔ محرم ۱۴۴۵ھ کا اختتام ہو چکا ہے، امسال کینیڈا میں ۵۰ سے زائد مرثیے کی مجالس کا انعقاد کینیڈا کو فروغِ مرثیہ میں شامل نمایاں ممالک اور مرثیے کے ایک اور نئے دبستان کی حیثیت سے سامنے لا رہا ہے۔ امسال غریب خانے پر تیسرے سالانہ عشرۂ تحت اللفظ خوانی کا انعقاد ہوا جس میں تین نوتصنیف مرثیے پیش کیے گئے، ساتویں محرم کو جناب علیؔ عرفان نے نوتصنیف مرثیہ بعنوان ''نطق'' سے محظوظ کیا، آٹھویں محرم کو جناب اخترؔ آصفؔ زیدی نے اضافی بند کے ساتھ درحال حضرت عباسؑ مرثیہ پیش کیا اور نویں محرّم کی مجلس میں جناب عابدؔ جعفری نے اپنے نوتصنیف مرثیے ''کربلا'' سے زینت بخشی، یہ مرثیہ اس شمارے میں قارئین کے لیے پیشِ خدمت ہے۔ اس کے علاوہ عشرے کی ابتدا مرتضیٰ حسین صاحب کی تحت خوانی سے ہوئی، دوسری محرم کو جناب صفدر اکبری، تیسری محرم کو جناب عمار زیدی، چوتھی محرم کو جناب رضا حیدر، پانچویں محرم کو جناب جواد حیدر امروہوی، چھٹی محرم کو جناب وسیم امروہوی اور عشرے کی آخری مجلس سے ناچیز نے تعشقؔ لکھنوی مرحوم کا مرثیہ پیش کیا۔ تیسرے سالانہ عشرے میں تین مرثیوں کے بعد چوتھے سالانہ عشرے میں ان شاءاللہ چار یا پانچ نوتصنیف مرثیے پیش کیے جائیں گے۔

ان دونوں فرہنگِ مونسؔ پر کام جاری ہے، ''دبیرؔ کے مرثیے۔ جلد چہارم'' تکمیل کی سرحدیں عبور کر کے پرنٹ میں جا چکی ہے، جلد پنجم پر کام جاری ہے اور انشااللہ ۲۰۲۴ء میں جلد پنجم و ششم آپ کے سامنے ہوں گی۔

فروغِ مرثیہ کا ۱۴واں شمارہ ادارے کی ۲۸ویں پیش کش ہے اور بغیر کسی قیمت ہندوستان و پاکستان میں اعزازی طور پر ترسیل کیا جاتا ہے، رثا کے موضوع کو زندہ رکھنے والا اور متواتر وقت پر شائع ہونے والا شاید یہ واحد شمارہ ہے جو ڈاکٹر ہلالؔ نقوی کے رثائی ادب کی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور اس میں ڈاکٹر ہلالؔ نقوی کے مشوروں کا بہت عمل دخل ہے۔

فروغِ مرثیہ کا سفر جاری و ساری ہے، یہ سفر لگن، محنت، مشقت اور جنون سے پُر ہے، درد صرف اس بات کا ہے کہ ۹۸ فی صد عوام نے مطالعے کو چھوڑ کر سوشل میڈیا میں تصویروں کی دنیا آباد کر لی ہے، وہ سوشل میڈیا جس کی عمر صرف چار گھڑی ہے، حیف یہ کہ کتاب کے ساتھ تصویریں بنوانا ایک مشغلہ مگر اسی کتاب سے سیکھنے کا عمل معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ ہم بحیثیت قوم کتاب سے اس قدر دوری اختیار کر چکے ہیں کہ بعض اوقات یہ گمان ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی قوم ہے جس کے نبیؐ پر کتاب کو معجزہ بنا کر بھیجا گیا تھا؟۔ اس کے علاوہ فروغِ مرثیہ کے ان منصوبوں میں تعاون تو دُور کی بات ہے، بعض افراد کے رویے مجبور کرتے ہیں کہ قلم ہاتھ سے رکھ دیا جائے اور جس حال میں رثا اور مرثیہ ہے اسے اسی

حال پر چھوڑ دیا جائے مگر کیا کیا جائے کہ اب بھی دنیا میں کچھ ایسے اکابرین موجود ہیں جن کی راہ پر چلنے میں مزا آتا ہے لہٰذا ان تمام مشکلات کے باوجود فروغِ مرثیہ کا سفر جاری رہے گا اور شخصیات سے زیادہ مرثیے کے فروغ پر توجہ رہے گی، آپ دعاؤں میں یاد رکھیے گا کیوں کہ آپ کی دعا اور آپ کی محبت ثابت قدمی اور حوصلے کا باعث ہے۔

اکتوبر کا مہینہ جناب شارب ؔ ردولوی اور راجہ محمد امیر محمد خان کے انتقال کی خبر لے کر آیا۔

جناب مسیّب عباسی المعروف شارب ردولوی دورِ حاضر میں اُردو تنقید کا ایک ستون تھے۔ شارب ؔ صاحب نے ادبی سفر کا آغاز شعر گوئی سے کیا، مگر تنقید نگاری کو اپنا موضوع بنایا۔ پروفیسر سیّد احتشام حسین کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ بھی ''جدید اُردو ادبی تنقید کے اصول'' کے موضوع پر تحریر کیا۔ آپ کی اہم تصنیفات میں ''مراثیِ انیس ؔ میں ڈرامائی عناصر''، ''مرثیہ اور مرثیہ نگار'' رثائی لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں۔

راجہ محمد امیر محمد خان بہترین تحت اللفظ خواں اور مرثیے سے محبت کرنے والے تھے۔ سب سے پہلے ان کا مرثیہ youtube پر سُنا۔ راجہ صاحب کی آواز، انداز، نشست و برخاست، فضائل و مصائب کی مناسبت سے تحت اللفظ خوانی انھیں موجودہ دور کے بہترین تحت اللفظ خواں میں شمار کرتی ہے۔ افسوس کہ ان تمام بزرگوں سے دنیا خالی ہوتی جا رہی ہے۔ مصروفیاتِ زندگی نے اگر موقع دیا تو ایک مرتبہ ضرور لکھنؤ جانے کی تمنّا ہے۔

طالبِ دعا

اصغر مہدی اشعر

۲۳؍ اکتوبر، ۲۰۲۳ء

ملٹن، کینیڈا

سلام

رضیؔ جعفری

نبی کا دِین ہے ممنونِ احساں زورِ حیدرؑ کا
صنم خانوں میں ڈنکا بج گیا اللّٰہُ اکبر کا

کِیا ہر معرکہ سَر شیرِ یزداں کے سِوا کس نے
اُحد کا، بدر کا ،صفّین کا ، خندق کا ، خیبر کا

علیؑ جیسا کوئی شوہر نہ زوجہ فاطمہؑ جیسی
نبیؐ کے گھر کی دُختر ہے پسر اللہ کے گھر کا

ہدایت کے لیے تنہا کتابِ حق نہیں کافی
نہ ہو جب تک تمسُّک دامنِ آلِؑ پیمبرؐ کا

رہَیں جِنّ و بشر محوِ عبادت گر چہ محشر تک
مگر پھر بھی نہ پائیں گے ثواب اک ضربِ حیدرؑ کا

علی شاگرد کو اپنے اذِیّت دے نہیں سکتے
اُڑا ہے شہپرِ جبریلؑ کا افسانہ بے پر کا

شجاعت میں سخاوت میں عبادت میں ریاضت میں
کوئی دِکھلا تو دے ثانی ابوطالبؑ کے دلبر کا

پیمبرؐ سب سے افضل ہیں مگر نسلی شرافت میں
پیمبرؐ سے ہے بڑھ کر مرتبہ شبّیرؑ و شبّرؑ کا

نہ رکھّا تھا کبھی شبّیر نے محروم سائل کو
نہ پُورا کر سکے لیکن سوالِ آب اکبرؑ کا

جب اپنی بےکسی پر شاہؑ نے فریاد کی روکر
گِرا جُھولے سے اصغرؑ استغاثہ سُن کے سَروَر کا

یہ مطلب تھا کہ اے آقا مَلالِ بے کسی کیا ہے
ابھی باقی ہے یہ ننّھا مُجاہد شہؑ کے لشکر کا

زبانی ادّعا ہے لغو سُن لے اے رضیؔ تیرا
عمل سے اپنے ثابت کر کہ تو شیعہ ہے حیدرؑ کا

سلام

عشرت آفریں

اے غبارِ سر کربلائے الم — کوئی سایہ نہیں شام ہونے کو ہے
اک چراغِ سرِ خاک دانِ حرم — آج جلتا نہیں شام ہونے کو ہے
نوکِ نیزہ پہ سورج نکلتا ہوا — خاک اڑتی ہوئی دشت جلتا ہوا
چار سو تیز تر وہ ہوائے ستم — دل ٹھہرتا نہیں شام ہونے کو ہے
چار سو ایک وحشت اثر خامشی — ماہ و انجم بھی سہمے ہوئے حیرتی
حیرتی خون روتی ہوئی چشمِ نم — اور دلاسہ نہیں شام ہونے کو ہے
خوف سے گنگ ہوتی ہوئی سسکیاں — خاک پر تھک کے سوتی ہوئی سسکیاں
نیزہ بردار چاروں طرف دم بہ دم — کوئی رستہ نہیں شام ہونے کو ہے
راکھ ہوتا وہ گہوارۂ روشنی — خاک ہوتا وہ مینارۂ روشنی
ریت پر سرنگوں راستی کا علم — غم کا یارا نہیں شام ہونے کو ہے
ہائے شامِ غریبانِ انسانیت — زد پہ شعلوں کی دامانِ انسانیت
ہو چکے بازوئے آدمیت قلم — کوئی نوحہ نہیں شام ہونے کو ہے
پھول جسموں کے بکھرے ہوئے خاک پر — خون تاریخ کے دستِ سفاک پر
روئے عصمت پہ ہیں وہ تمانچے رقم — وقت بھولا نہیں شام ہونے کو ہے
ایک معصوم آواز نوحہ کناں — اے مرے عمو جاں اے مرے عمو جاں
جلد آجایئے اب ہے ہونٹوں پہ دم — پاس بابا نہیں شام ہونے کو ہے
شعلۂ انتقامِ حنین و اُحد — پھر سے ہے تیز تر یا علیؑ المدد
المدد رحمتِ حق رسولِؐ اُمم — غم کا یارا نہیں شام ہونے کو ہے
مشعلِ غم سنبھالے ہوئے سر بہ سر — ایک قوت ہے آلِ نبیؐ کی سپر
ہر نفس جرأت و آگہی ہم قدم — لب پہ شکوہ نہیں شام ہونے کو ہے
ایک آواز پہرے پہ مامور ہے — گرد خیموں کے اک حلقۂ نور ہے
جس کی ہیبت سے لرزاں ہیں اہلِ ستم — گو اجالا نہیں شام ہونے کو ہے

سلام

کلیمؔ ظفر

واقفِ رمزِ کُن فکاں ہی نہیں
وہ جنہیں فرصتِ فغاں ہی نہیں
فرشِ ماتم سا جاوداں ہی نہیں
اس اماں سی کہیں اماں ہی نہیں
اپنا مکتب بھی اپنا مقصد بھی
کربلا صرف داستاں ہی نہیں
دل پہ سکّہ ہے وہ محرّم کا
کچھ یہاں قیمتِ جناں ہی نہیں
جلوہ ساماں ہیں لولو و مرجاں
بامِ مژگاں پہ کہکشاں ہی نہیں
جا رہے ہیں وہ زائرانِ حسینؑ
حق نورد ایسا کارواں ہی نہیں
میرے آنسو ہیں بس مرے آنسو
اور مرا کوئی ترجماں ہی نہیں
کربلا کس قدر معلّیٰ ہے
اس زمیں سا تو آسماں ہی نہیں
ابر ہے مجلسِ غریباں کا
شامِ غم اب دھواں دھواں ہی نہیں
قامتِ قوتِ دلِ شبیرؑ
نام اصغرؑ کا بے زباں ہی نہیں
میرا سینہ ہے ماتمی سینہ
بے دلی کا یہاں گماں ہی نہیں
شہؑ کے پرچم تلے ملیں گے ہم
اور اپنا کوئی نشاں ہی نہیں
ہم شہیدِ شہِؑ زماںؑ ہیں کلیمؔ
بارِ ہستی ہمیں گراں ہی نہیں

سلام

احمر شہوارؔ

بلادِ قربِ بُلا رہی ہے قریب آؤ تو رب ملے گا
حسینؑ اقدس کے در پہ قلب ونظر جھکاؤ تو رب ملے گا

اسی بیابانِ آگہی سے فراتِ ہستی گزر رہی ہے
تم اپنے شوق وطلب کے خیمے یہاں لگاؤ تو رب ملے گا

جو وعدہ گاہِ حسینؑ ٹھہری خراجِ عشق و وفا طلب ہے
ہے سرفروشی میں سرفرازی جو سر کٹاؤ تو رب ملے گا

وہ طورِ سینا کا نور کرب و بلا کے ذرّوں سے منعکس ہے
ان آئینوں میں جمالِ روئے حسینؑ پاؤ تو رب ملے گا

ابھی بھی توثیقِ کربلا میں حسینؑ خیمے میں منتظر ہیں
چراغِ رمزِ وفا بجھا ہے اسے جلاؤ تو رب ملے گا

اذانِ اکبرؑ بھی ہو رہی ہے صدائے ھل من بھی آ رہی ہے
معآلِ حرؑ کا یقین لے کر قدم بڑھاؤ تو رب ملے گا

عطا کے چرچے شفا کے نسخے دعا کی مقبولیت کے قصّے
سبھی تو بابِ رسا یہیں ہیں جو کھٹکھٹاؤ تو رب ملے گا

یہاں ہے طوفانِ شورِ ماتم یہاں تلاطم ہے آنسوؤں کا
بُھلا کے دنیا عزائے سرورؑ میں ڈوب جاؤ تو رب ملے گا

جہادِ کرب و بلا کا محضر ابھی مکمّل نہیں ہوا ہے
رہِ عزا میں ضمیر و فکرِ بشر جگاؤ تو رب ملے گا

جواں پسر کے فگار سینے سے برچھی کھینچی ہے شاہِ دیںؑ نے
مقامِ اکبرؑ پہ چاکِ ماتم سے خوں بہاؤ تو رب ملے گا

حسینؑ اصغرؑ کی لاش تھامے تڑپ کے تم کو پکارتے ہیں
صدائے لبیکَ یا حسیناؑ لبوں پہ لاؤ تو رب ملے گا

جہاں سے عباسِؑ نامور کے بریدہ بازو اٹھائے شہؑ نے
اسی مقامِ کفِ جریؑ سے علم اٹھاؤ تو رب ملے گا

یہی ہے ایفائے عہدِ طفلی کہ تیر اٹھاتے ہیں شہؑ کا لاشہ
جو وعدہ شہؑ سے کیا ہو تم نے اسے نبھاؤ تو رب ملے گا

کبھی تو شہوارؔ کا مقدّر وہ دن دکھائے کہ شاہؑ کہہ دیں
سلام کرب و بلا میں آ کر ہمیں سناؤ تو رب ملے گا

❀❀❀❀

سلام

ڈاکٹر جاوید منظرؔ

ہم نے دریا جسے سمجھا وہ سمندر آنکھیں
دے گئیں اشکِ رواں سوچ سے بڑھ کر آنکھیں

شاید اس طرح سے مولا کی زیارت ہو نصیب
جا کے رکھ آیا ہوں میں خوب کے در پر آنکھیں

بیٹھے بیٹھے کہیں رونے سے بھی تقدیر بنی
مجلس شہؑ میں بناتی ہیں مقدر آنکھیں

کون ہوتا ہے درِ شاہؑ پہ اشکوں کی سبیل
دیکھتی رہتی ہیں مجلس میں برابر آنکھیں

ایک دن مشک میں آئے گا سمٹ کر دریا
سب کو کر جائیں گی اک روز یہ ششدر آنکھیں

آؤ ہم آج بتاتے ہیں بصارت کیا ہے
کس طرح بنتی ہیں یہ نور کا پیکر آنکھیں

ان کو ملتی ہیں درِ روضہ شبیرؑ کی خاک
تب کہیں جا کے یہ ہوتی ہیں منور آنکھیں

کیسے ممکن ہے بصیرت کی نظر ہو ان میں
نورِ حق جو نہ رکھیں بال برابر آنکھیں

شبِ عاشور جو دیکھ آئی ہیں جنت میں مقام
دینِ حق تیری نگاہوں کا وہ محور آنکھیں

منکرو تم کو بھی مل جائے بصیرت کی نگاہ
کاش دے جائیں تمہیں حرؑ سا مقدر آنکھیں

حرملہ تیر چلاتا ہے مگر دیکھ تو لے
کتنی معصوم ہیں یہ، پیاس کا پیکر آنکھیں

عطرتِ آلِ نبیؐ مقنعہ و چادر کے بغیر
دیکھتی ہیں سرِ بازار یہ اکثر آنکھیں

دیکھنا روضہ عباسؑ کا وہ جاہ و جلال
آج بھی کانپتی ہیں خوف سے تھر تھر آنکھیں

کس طرح چہرے کو زینبؑ نے چھپایا ہوگا
سات سو کرسی نشیں ، اُن کی وہ خنجر آنکھیں

سرمہ کس طرح بنی روضۂ شبیرؑ کی گرد
روز آئینہ دکھاتی ہیں یہ منظرؔ آنکھیں

❋❋❋❋

سلام

جوہرؔ عباس

لوحِ محفوظ ہے پابندِ تمنّائے حُسین
کیا مشیّت ہے بجُز جُنبشِ لب ہائے حُسینؑ

درِ عباسؑ پہ خم اپنی جبیں رکھتا ہوں
سیکھنے کے لیے آدابِ تولاّئے حُسینؑ

اُسے ظلمت سے بہر کیف نکل آنا تھا
حُرؑ کی آنکھوں میں تھا روشن رخِ زیبائے حُسینؑ

مر کے زندہ ہوئے اور پھر ہوئے مولا پہ نثار
ہم نے دیکھا نہ حبیبؑ آپ سا شیدائے حُسینؑ

سر کِیا عقل نے جب کوہِ کمالِ رفعت
سب سے اونچا نظر آیا قدِ بالائے حُسینؑ

خاک ہونے کی تمنا وہ خوش انجام کرے
آپ کے شہر کی جو آب و ہوا پائے ، حُسینؑ

خود کو جھولے سے گرا دیں تو تعجّب کیسا
ورثہ دارانِ شہادت ہیں یہ اَبنائے حُسینؑ

نوکِ نیزہ کی بلندی پہ تلاوت کی قسم
فتح میں آپ کی ہرگز نہیں دو رائے حُسینؑ

کہیں قاسمؑ کا سراپا کہیں اکبرؑ کا جمال
دشت میں بکھرے پڑے تھے سبھی گُلہائے حُسینؑ

عرصۂ حشر تھا اور تھی یہ کسی ماں کی فغاں
ہائے عباسِؑ علیؑ ہائے حسنؑ ہائے حُسینؑ

صلب سے اُن کی ہوں جوہر کہ جنھوں نے برتا
جان کر روحِ عبادت غمِ والائے حُسین

سلام

وفاؔ نقوی

نسبتِ ابنِ علیؑ پر فخر ہے
ہم کو آنکھوں کی نمی پر فخر ہے

ہم حسینؑ ابنِ علیؑ کے ہیں غلام
ہم کو اپنی نوکری پر فخر ہے

ہے جہاں سبطِ پیمبرؐ کا مکان
اس زمیں کو اس گلی پر فخر ہے

دشمن آلِ نبیؐ سے کیا غرض
ہم کو اپنی بے رخی پر فخر ہے

ہو حبیب ابنِ مظاہرؓ کو سلام
شہؑ کو ان کی دوستی پر فخر ہے

جس نے روشن کردیا عاشور کو
شہؑ کو ایسی تیرگی پر فخر ہے

آگیا جنت میں دوزخ چھوڑ کر
حرؓ کو اپنی آگہی پر فخر ہے

شوق سے دریا کو رکھو باندھ کر
شاہِؑ دیں کو تشنگی پر فخر ہے

جس کو ٹھوکر مار دی عباسؑ نے
کربلا کو اس ندی پر فخر ہے

رکھ دیا زعمِ یزیدی توڑ کر
ایک بچے کو ہنسی پر فخر ہے

ایک سجدہ جو ہوا خنجر کے ساتھ
سب نمازوں کو اسی پر فخر ہے

ہم وفاؔ نقوی ہیں کلبِ بوترابؑ
ہم کو اپنی زندگی پر فخر ہے

❀❀❀❀

سلام

حسن رضوی حرؔ

اے حسین ابن علی عرش کے مطلوب سلام
کہہ رہے ہیں تجھے اللہ کے محبوب سلام

ہفت افلاک پہ ہے غلغلہِ عزمِ حسین
کبھی ایوبؑ کبھی کہتے ہیں یعقوبؑ سلام

اب کسی اور کی خاطر یہ نہیں صنفِ سخن
ہوگیا کربلا والوں ہی سے منسوب سلام

لاکھ بے عقل ہو ، پر اتنی سمجھ رکھتا ہے
نام سن لے جو ترا کرتا ہے مجذوب سلام

بولے مسلمؑ ارے او ! ننگِ جہاں ، ابن زیاد!
تجھ سے مفسد کو کرے، دِین کا مندوب سلام!!!

خوب تاکید سے کہلایا تھا صغرؑا نے اسے
کہیو اکبرؑ سے جو دیکھو مرا مکتوب: ’’سلام‘‘

مرحبا سیدِ احرار حسینؑ ابنِ علیؑ
حرؔ صفت کرتے ہیں تجھ کو مرے یعسوب سلام

❀❀❀❀

سلام

پروینؔ حیدر

یزیدیت سے کھلی جنگ ہے مری تحریر
حسینیتؑ سے ہم آہنگ ہے مری تحریر

لکھی ہے میں نے لہو رنگ روشنائی سے
اسی لیے تو لہو رنگ ہے مری تحریر

حدیثِ عشق کو میثم قریبِ منبرِ دار
بیان کرتے ہیں اور دنگ ہے مری تحریر

کیا ہے حرف کو تصویر کتنے رنگوں سے
نگار خانۂ ارژنگ ہے مری تحریر

وہ شام جس میں کہ آہوں کی تھی عزاداری
اسی کے غم میں شفق رنگ ھے مری تحریر

مرا قلم ہے ازل سے مزاج دارِ الم
کتابِ درد کی فرہنگ ہے مری تحریر

وہ ایک پیاس دمِ تشنگی جو یاد آئی
اسی کی یاد میں خوں رنگ ہے مری تحریر

اکھاڑ ڈالا جو زہرؑا کی قبرِ اطہر سے
زمینِ دل پہ وہی سنگ ہے مری تحریر

دیا ہو جس نے مرے لفظ کو نیا آہنگ
ہر اس کتاب کے پاسنگ ہے مری تحریر

وصال و ہجر عطش عشق و انتظار و فغاں
بہم ہوئے تو ہمہ رنگ ہے مری تحریر

فرشتگانِ حساب و کتاب کو ہو نوید
تہہِ مزار مرے سنگ ہے مری تحریر

غیر مطبوعہ مرثیہ ''کربلا''

عابدؔ جعفری

تاثیرِ انقلابِ شریعت ہے کربلا   تصدیق و اعتبارِ نبوّت ہے کربلا
تنویرِ عزم و مہرِ شجاعت ہے کربلا (۱) تصویرِ اصلِ یومِ قیامت ہے کربلا
سانسوں میں حق شناسوں کے اِس کا جواز ہے
یہ بھی عجیب ایک مشیّت کی راز ہے

منزل براہِ کارِ پیمبرؐ ہے کربلا   عقل و شعور و فہم کا محور ہے کربلا
ہم ہیں سخن شناس ، سخنور ہے کربلا (۲) اک دوپہر کے ذکر کا دفتر ہے کربلا
آنکھوں کی کیا مجال رہیں اِس کی تاب میں
دریا کبھی سما نہیں سکتا حباب میں

کس کا یہ حوصلہ ہے کرے کربلا کی بات   لکھی ہوئی ہے آبِ رواں پر ہوا کی بات
گلشن کا جو مکیں ہے وہ جانے صبا کی بات (۳) ہم بے لباس لوگ کریں کیا قبا کی بات
توصیف کس طرح ہو قلم جانتا نہیں
لفظوں کی احتیاج کو پہچانتا نہیں

ہے کربلا کا ذکر تصوّر کا امتحاں   منزل وہ ہے یہ جس کا مسافر نہیں گماں
لائیں ذرا خیال میں کیا ہوگی اِس کی شاں (۴) جس کو کیا ہو احمدِ مرسلؐ نے خود بیاں
جس کی ثنا میں نطقِ شہِؑ خاص و عام ہے
اِس پر جہاں کی ساری فضیلت تمام ہے

ذرّے ہیں اِس زمینِ مکرّم کے یا گُہر   آنکھوں سے آ ملیں تو بصارت ہو تیز تر
ہو جائے اِس کے وصف سے واقف اگر بشر (۵) رکھ دے جو ایک بار اُٹھائے کبھی نہ سر
ذرّوں پہ اِس زمیں کے ہدایت کا بار ہے
اس میں بشر کا کھویا ہوا افتخار ہے

پنہاں ہے اِس میں عظمتِ انساں کی داستاں ہے تشنگانِ حق کے لیے بحرِ بے کراں
جو کارِ انبیاؑ تھے وہ سب اِس میں ہیں نہاں (۶) دیکھے بسر جو کھول کے آنکھیں تو ہیں عیاں
اِس کی کوئی مثال نہیں ، بے مثال ہے
اِس کے بغیر خُلد کو پانا محال ہے

کیا دم ہے اُن میں اِس کا جو بھرتے نہیں ہیں دم اِس کا وجود دورِ تنفس سے محترم
اِس نے جہاں میں رکھ لیا انسان کا بھرم (۷) کرتے اِس پہ اہلِ تفکّر جبینیں خم
ظاہر نہیں ہے جس کا ، یہ اُس کا ظہور ہے
جس سے عیاں تجلی رب ہو وہ طُور ہے

وجہِ دلیلِ خالقِ اکبر ہے کربلا اصلِ نظیرِ رُشدِ پیمبرؐ ہے کربلا
رشکِ وغائے حیدر و صفدرؑ ہے کربلا (۸) اذنِ نمودِ بستِ گُلِ تر ہے کربلا
سب اوج و افتخار ہیں اِس کی پناہ میں
کتنے ہی سر بلند ہوئے اِس کی چاہ میں

سوچو تو رکھ کے سامنے تصویرِ کائنات کیا کربلا سے پہلے تھی توقیرِ کائنات
اِس کے سبب سے کُھل گئی تقدیرِ کائنات (۹) اب آسماں پہ جاتی ہے تنویرِ کائنات
اونچا کچھ اور عرش کا پندار کردیا
اِس کربلا نے فرش کو بیدار کردیا

اِس کربلا نے رکھ دیا ایثار ، حق کا نام عزمِ صمیم و سطوتِ کردار ، حق کا نام
فتنہ گروں کے سامنے دیوار ، حق کا نام (۱۰) لینا بشر کو اب نہیں دشوار حق کا نام
اتنے دریچے کھول دیئے حق کے نام کے
بیٹھے ہیں شر پسند کلیجے کو تھام کے

اِس سے کُھلا جہانِ تردّد میں بامِ حق اِس سے ملا شعورِ بشر کو دوامِ حق
اِس سے چلا خدا کی زمیں پر نظامِ حق (۱۱) اِس سے ملا جو ہم کو ملا ہے کلامِ حق
یہ آج دینِ حق کا جو گردش میں جام ہے
یہ کربلا کی خاک نشینی کا کام ہے

یہ وجہِ زندگی ہے ، مگر جانتا ہے کون یہ شرطِ بندگی ہے ، مگر جانتا ہے کون
ہر شان اِس کی ہی ہے ، مگر جانتا ہے کون (۱۲) اِس میں وفا پلی ہے ، مگر جانتا ہے کون
اِس کی صفات کو جو بشر جان جائیں گے
وہ بالیقیں علیؑ کو علیؑ مان جائیں گے

اوصاف کربلا کے ہیں بے مثل و لازوال تاریخِ انبیاؑ میں بھی ایسی نہیں مثال
اِس پر تمام ہوگیا آکر ہر اک کمال (۱۳) اِس سے مزاجِ نوِ بشر کر دیا بحال
کافر کے واسطے ، نہ مسلماں کے واسطے
یہ رہنما ہے فطرتِ انساں کے واسطے

منسوبِ ترجمانِ رسالت یہی تو ہے مرغوبِ عاشقانِ ہدایت یہی تو ہے
مطلوبِ عزّ و شانِ بصارت یہی تو ہے (۱۴) ہر دور کے بشر کی ضرورت یہی تو ہے
یہ منتخب ہے قلبِ شہؑ تشنہ کام کی
تسبیح پڑھ رہے ہیں جو ہم اِس کے نام کی

حیراں ہے فکر طرزِ بیانی کہاں سے لائے تشبیہ کو مثالِ زمانی کہاں سے لائے
یہ تشنگی کا دور ہے پانی کہاں سے لائے (۱۵) سب بے نشاں ہیں اِس کی نشانی کہاں سے لائے
تو اِس جہاں میں آپ ہی اپنا جواب ہے
تیری مثال ڈھونڈنا کارِ سراب ہے

تیرا جمال سب سے جدا ، سب سے ہے الگ طرزِ کمال سب سے جدا ، سب سے ہے الگ
ماضی و حال سب سے جدا ، سب سے ہے الگ (۱۶) کیا قیل و قال سب سے جدا ، سب سے ہے الگ
تیری زمینِ حق کو طرح دار ہونا تھا
تجھ پر ظہورِ عظمتِ کردار ہونا تھا

تجھ پر شجاعتوں کے چمکنے تھے آفتاب ہونا تھا تیری خاک سے تسخیر انقلاب
کھلنا تھا تیری گود میں قربانیوں کا باب (۱۷) تجھ کو جہانِ عشق میں ہونا تھا لاجواب
واللہ کیا کہوں کہ جو تقدیر تیری ہے
ہر قلبِ حق پسند میں تصویر تیری ہے

چلتا ہے ذکرِ جاہ و حشم تیرے نام سے رہتے ہیں سوگوار بہم تیرے نام سے
زندہ ہیں ہر زمانے میں ہم تیرے نام سے (۱۸) ہوتا ہے ہم پہ فضلِ قلم تیرے نام سے
سب تیرے نام کا ہے تصدق جو پایا ہے
ہم بے بضاعتوں کو سخن ور بنایا ہے

تُو نے عطا کیا وہ خزانہ برائے فن فکرِ بشر میں سج گئی شعروں کی انجمن
تیری رضا سے ذہن میں آئے نئے سخن (۱۹) قریہ بہ قریہ کھل گئے اظہار کے چمن
نوکِ قلم کو وصفِ کرامت عطا کیا
لفظوں کو اک نیا قد و قامت عطا کیا

لب بستگی سے تُو نے بنائی صدائے حق   ساکت ہے اور پھرتی ہے ہر جا اُٹھائے حق
رکھا ہے تُو نے سینہ کشادہ برائے حق (۲۰) سارے جہاں میں پڑ گئی تجھ سے بنائے حق
اقبال ترے ہی دم سے سوا ہے زمین کا
حکمِ خدا سے کام کیا تُو نے دین کا

کیا رشکِ گُل زمین و زماں ہے ترا وجود   تجھ پر ہوا ہے اک نئے انسان کا ورود
جس کی ثنا میں پڑھتے ہیں اہلِ جہاں درود (۲۱) جس کی صدا سے شق ہوا افکار کا جمود
چشمِ بشر پہ تھے جو ، وہ پردے اُٹھا دیئے
گویا مسیحِ وقت نے مُردے جِلا دیئے

تیرا وجود اہلِ وِلا کا ہے دل پسند   تجھ سے ہوئی ہیں ظلم و ضلالت کی راہیں بند
ڈالے گا کوئی کیا ترے افکار پر کمند (۲۲) تو حشر تک رہے گی سلامت اے درد مند
اے کربلا جو تجھ کو قدم چُھو کے آئیں گے
کیا وہ صراطِ حق پہ کبھی ڈگمگائیں گے

پھیلے تو کائنات ہے ، سمٹے تو اک مقام   ادراک تیرا خاص ہے ، دیدار تیرا عام
تیرا وضو ہے گریہ ، عبادت ہے احترام (۲۳) تیری کوئی اذاں نہ مصلّے کا اہتمام
تجھ میں کوئی بھی قید نہیں صبح و شام کی
خادم ہے تو حسین علیہ السلام کی

رطب اللساں ہیں تیرے حکیمانِ شش جہت   عرشِ بریں سے بھی ہے سِوا تیری منزلت
مہمیزِ عزمِ حق نگاراں ، تیری معرفت (۲۴) قائم رہے گی تا بہ ابد تیری مملکت
تُو ہے قیامِ امن کے بانی کا انتخاب
بس اک تری ہی خاک سے اُٹھیں گے انقلاب

دیکھی ہے تُو نے عظمتِ کردارِ اہلِ حق   فوجِ عدو کے سامنے ، دیوارِ اہلِ حق
تیغ و تبر کی چھاؤں میں ، ایثارِ اہلِ حق (۲۵) بیعت کے ہر سوال پر ، انکارِ اہلِ حق
کتنے عجیب یہ ترے صحرا کے لوگ ہیں
اے کربلا یہ کون سی دنیا کے لوگ ہیں

یہ کس جہاں سے آئے ہیں ، کیا اِن کا ہے نسب   چشمِ فلک نے دیکھے کہاں یہ قضا طلب
جینے سے بے نیازی کا ہوگا تو کچھ سبب (۲۶) کیوں کر سمائے ایک ہی سانچے میں سب کے سب
اے کربلا بتا یہ ہوائیں کہاں کی ہیں
یہ طمطراق اور یہ ادائیں کہاں کی ہیں

اے کربلا ! اے ارضِ شہیداں فلک مقام دنیا ہے تیرے ذکر میں مشغول صبح و شام
ہیں تیری عزّ و شان سے آگاہ خاص و عام (۲۷) تیری زمیں پہ حق کے ولی نے کیا قیام
تیری فضیلتوں کا ٹھکانہ کوئی نہیں
یہ حق کا تذکرہ ہے فسانہ کوئی نہیں

ہوتی ہے آج تیرے حوالے سے دیں کی بات تیری زمیں ہے فخر و مباہاتِ کائنات
بے راہ روں کو جس میں ملی ہے رہِ نجات (۲۸) اس خاک پر پڑے جو قدم مل گیا ثبات
کرتی ہے اہلِ غم کو یہ گمراہیوں سے دُور
اِس خاک میں بھی وصف ہدایت کا ہےضرور

موقوف اِس پہ ہے عزاداروں کی زندگی پاتے ہیں دل میں شامِ غریباں سے روشنی
بھرتا نہیں ہے تیری زیارت سے من کبھی (۲۹) تیرے بغیر رہتی ہے ہر آن بے کلی
آنکھوں میں تیرے نام سے آنسو بھر آتے ہیں
ہم اپنے سارے رنج و الم بھول جاتے ہیں

تیری زمیں سے وہ لیا خالق نے امتحاں جس پر لُٹا نبیؐ کے گھرانے کا کارواں
جس میں رہِ وفا کے مسافر ہوئے نہاں (۳۰) جس پر لکھی گئی نئی دہشت کی داستاں
واجب نہ تھے جو تجھ پہ وہ صدمے اُٹھا گئی
تو بھی برائے دینِ خدا کام آگئی

دیکھے ہیں تیری آنکھوں نے منظر وہ دل خراش دیکھے جو کہسار تو ہوجائے پاش پاش
دیکھی نہ ہوتی یہ ستم آرائی تُو نے کاش (۳۱) اک باپ ہے اُٹھائے ہوئے نوجواں کی لاش
چہرے پہ ہے ملال کمر ہے جھکی ہوئی
سوغات ہے یہ اہلِ عداوت کی دی ہوئی

اے کربلا ! نبی کے نواسےؑ کی رازدار آنکھوں کو بند کر لے ذرا بہرِ کردگار
آتا ہے قتل گاہ میں اک طفلِ شِیرخوار (۳۲) خیمے میں جس کی ماں کا کلیجہ ہے بے قرار
اُس کو ملے گی تشنہ دہانی کی یہ سزا
چھیدے گا تیر سے کوئی معصوم کا گلا

دیکھے ہیں تُو نے عونؑ و محمدؑ سے نونہال خوش شکل و خوش اطوار و خوش انداز و خوش خصال
جن سے خطا کا کوئی تصوّر نہ احتمال (۳۳) اُن سے بھی اشقیا نے کیا دشت میں قتال
تیغ و تبر کی زد پہ تھے دونوں جدھر گئے
صد حیف لعل زینبِؑ مضطرؑ کے مر گئے

تُو نے سنی چچا سے بھتیجے کی گفتگو وہ دینِ حق پہ جاں سے گزرنے کی جستجو
جس کی رگوں میں تھا اسداللہ کا لہو (۳۴) نصرت میں دینِ حق کی وہ مرنے کی آرزو
ابنِ حسنؑ کا دشت میں یہ حال ہوگیا
لاشہ بھی اُس غریب کا پامال ہوگیا

وہ ابنِ شاہِؑ خیبر و خندق ، وہ شیرِ نر جس میں اباالحسنؑ کی شباہت تھی سر پہ سر
ہم شکل و ہم صفات و ہم آواز و ہم سیر (۳۵) قبضہ کیا تھا جس نے اکیلے ہی گھاٹ پر
کیسے کہوں کہ کیا لبِ دریا ستم ہوئے
مشکِ سکینہؑ چھد گئی بازو قلم ہوئے

ہر سو بلا کی دھوپ ہے تنہا ہے تشنہ کام سر کو کٹائے سوتے ہیں مقتل میں سب غلام
حسرت سے دیکھتا ہر اک سو میرا امامؑ (۳۶) کوئی کہیں نہیں کہ کرے جس سے وہ کلام
تیغوں کا شور ہے مگر آواز بھی نہیں
دشمن ہیں چار سُو کوئی دم ساز بھی نہیں

یہ کربلا ہے ، مسکنِ رنج و غم و ملال سوتا ہے سر کٹائے یہاں فاطمہؑ کا لعلؑ
اس پر ہوئے وہ ظلم کہ جن کی نہیں مثال (۳۷) اُن کو بیاں کرے کوئی یہ امر ہے محال
اہلِ نظر نے اِس کو جو مرکز بنایا ہے
اِس کربلا میں شہؑ نے بھرا گھر لُٹایا ہے

❀❀❀❀

دبیرؔ کے مرثیے
(جلد پنجم)
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

فرہنگِ مونسؔ
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

دبیرؔ کے مرثیے
(جلد چہارم)
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

میر انیسؔ کی تخلیقی صلاحیت کا تجزیہ کیسے ہو

ڈاکٹر تمثال مسعود

کسی تخلیق کار کی فنی صلاحیتوں کے سمجھنے اور اُن کا تجزیہ کرنے کے لیے اُس کی تخلیق ہی بنیادی حوالہ ہے، یہ بالکل سامنے کی بات ہے۔ چھپنے کی صورت میں تحریر کی حیثیت حرفِ آخر سی ہو جاتی ہے اور یہی چھپے ہوئے لفظ تخلیق کار کے فن کا تجزیہ کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ چونکہ ایک غلط چھپا ہوا لفظ تحریر کی تفہیم اور تعبیر میں الجھاؤ پیدا کرسکتا ہے اس لیے تخلیق کار کا اپنی چھپی ہوئی تخلیق کے ساتھ نازک رشتہ ہوتا ہے۔ اِس کی مثال کے لیے اسداللہ خاں غالبؔ کے وہ خط دیکھے جاسکتے ہیں جن میں اُنھوں نے اپنی تحریروں کی چھپائی کے سلسلے سے گفتگو کی ہے جیسے منشی شیونارائن آرامؔ اور منشی ہرگوپال تفتہ کے نام خط۔ ایک غالبؔ ہی کیا کوئی بھی تخلیق کار یہ نہیں چاہے گا کہ اُس کی تحریر غلطیوں کے ساتھ شائع ہو اِس لیے کہ اِن چھپے ہوئے لفظوں میں اُس کی تخلیقی صلاحیت اپنی آخری حد پر منجمد ہوکر حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہے۔ خواندگی کی روایت کا معاملہ طباعت سے مختلف ہے۔ خواندگی میں تخلیق کار اپنے سامعین سے براہِ راست مخاطب ہوکر اپنی تخلیق کو پیش کرتا ہے اور ہر پیش کش کے لیے وہ اپنی تخلیقی صلاحیت سے کام لیتا ہے جس کے نتیجے میں اُس کی تخلیق کبھی اپنی آخری حد پر منجمد ہوکر حرفِ آخر نہیں بن سکتی۔ اِس پس منظر میں ۱۹رویں صدی کے اردو مرثیہ نگار اور مرثیہ خوان میر ببر علی انیسؔ کے حوالے سے آگے کی بحث کی ابتدا ہو رہی ہے۔

میر انیسؔ صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ وہ سامعین کے سامنے کلام کی فنکارانہ ادائگی بھی کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ سامعین کے سامنے کلام کی فنکارانہ ادائگی کی خاطر ہی شاعری کرتے تھے، یہ ادائگی اُن کی شاعری اور شخصیت کا خاص مرکب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میر انیسؔ کے متعلق جو بیان ملتے ہیں اُن میں زیادہ حصہ اُن کی پڑھت کے سلسلے کا ہے کہ اُنھوں نے کس انداز سے کلام کو پیش کیا۔ میر انیسؔ کی فنکارانہ ادائگی کی مثالیں تحریری بیانوں کی صورت کے علاوہ کسی دوسری صورت سے محفوظ نہیں ہوسکیں کیونکہ چلتے پھرتے منظروں کے تحفظ کی اُس وقت تک کوئی تکنیک ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ میر انیسؔ کا معاملہ تو اور بھی نازک ہے کہ لکھنؤ میں کتابوں کی چھپائی کی شروعات ہو جانے کے باوجود اُنھوں نے کبھی اپنی شاعری کو دیوان، کلیات، یا انتخاب کی صورت سے چھپوایا نہیں یعنی لوگوں کے لیے بس مجلس ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں میر انیسؔ کے کلام تک اُن کی رسائی تھی، وہ بھی صرف سُن اور دیکھ سکنے کی حد تک۔

خوش قسمتی سے میر انیسؔ کا کلام قلمی بیاضوں میں موجود تھا جو انیسؔ کی وفات (۱۸۷۴ء) کے بعد کتابی صورت میں چھپنا شروع ہوا۔ یوں میر انیسؔ کی عدم موجودگی میں چھپنے والے کلام کی بنیاد پر بیشتر اُن کے فن کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے عرض کرنا ہے کہ نول کشور پریس نے سب سے پہلے میر انیسؔ کے مرثیے ۴رجلدوں میں شائع کیے تھے۔ اِن چار جلدوں کے قریب ایک ہزار دو سو تیس صفحوں میں شاید ایسا ایک صفحہ نہیں ہے کہ جس پر کوئی غلطی نہ ہو۔ اِس کے علاوہ میر انیسؔ کا جو کلام قلمی مخطوطوں کی شکل میں موجود ہے اُن میں بھی اختلاف ہے

یعنی کلام کی آخری اور مستند صورت تک ہم لوگوں کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ظاہر ہے اِس حیثیت کے قلمی مخطوطے اور غلط چھپے ہوئے کلام کا تجزیہ مکمل طور پر میر انیسؔ کی شعری استعداد کا احاطہ نہیں کرسکتا۔میر انیسؔ کی مرثیہ خوانی کی جیتی جاگتی مثالوں اور اُن کے مستند کلام کی غیر موجودگی میں میر انیسؔ کے فن کا تجزیہ کس نوعیت کا ہوگا،اِس مضمون میں اِسی نکتے پر بحث کرنے کی سعی کی جارہی ہے۔

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ میر انیسؔ اپنے کلام کو سامعین کے سامنے خود ہی پیش کرتے تھے۔اِس صورت میں یہ مانا جائے گا کہ میر انیسؔ جب اپنے مرثیے کے تخلیقی عمل میں سرگرم ہوتے تھے تو وہ اِس بات کا خاص خیال رکھتے ہوں گے کہ زبان سے ادا ہونے کی صورت میں مجلس میں موجود سامعین پر کلام کیا اثر کرے گا۔ادائگی کے فن کے حوالے سے دیکھا جائے تو کلام میں موجود لفظوں کی خاص نوعیت سے کی جانے والی ادائیگی کی بنا پر اُن کے اثر میں تنوع پیدا کیا جاسکتا ہے۔اِسی لیے شعر کی فنکارانہ ادائگی کے لیے شعرخوانی کی اصطلاح موجود ہے۔اِس کے ساتھ شعرفہمی کا معاملہ ہے یعنی شعر کے معنی کا سمجھنا۔شعرخوانی کے فن کے ذریعے پیش کش کے دوران لفظوں کی معنوی تہوں کو سامعین پر منکشف کردینے کو کلام کی تفہیمی خواندگی کہا جائے گا۔مرثیے کے پس منظر میں اِس کی مروج اصطلاح مرثیہ خوانی ہے۔مرثیہ خوانی میں شعرخوانی اور شعرفہمی کی صلاحیت کو بروے کار لاکر باکمال مرثیہ خوان لفظوں،مصرعوں،اور بندوں کی مختلف خواندگی سے مختلف اثر پیدا کرکے کلام کے کینوس کو وسیع کردیتے تھے۔میر انیسؔ کی خواندگی کا ایک بیان ملتا ہے کہ ایک بار اُنھوں نے پورے مرثیے کو دو دن دو الگ طرح سے پیش کیا اور دونوں دن سننے والوں کی طبیعت دو طرح سے محظوظ ہوئی۔یعنی میر انیسؔ نے صرف مصروعوں اور بندوں میں ہی نہیں بلکہ پورے مرثیے کی مجموعی معنویت اور کیفیت میں مختلف اثر پیدا کیے تھے۔یہ مرثیہ خوانی کا فن ہے اور سب تسلیم کرتے ہیں کہ اِس کے کمال کے درجے پر میر انیسؔ فائز ہیں۔

اِس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مرثیے کا خواندگی کی روایت یعنی oral tradition سے بہت گہرا تعلق ہے۔خواندگی کی روایت کی رو سے فنکار کاغذ پر لکھے ہوئے متن کی قید سے کچھ آزاد سا رہتا ہے۔اُس کی اصل توجہ متن کی معنوی تہوں پر اور لفظوں کی ادائگی پر رہتی ہے۔اِس طرح متن کی اہمیت بنیادی ہونے کے باوجود ثانوی بھی ہوجاتی ہے اور ضمنی بھی یعنی جو لکھا ہوا ہے اُس کو کس طرح سے پیش کیا جائے گا،یہ زیادہ اہم ہے۔اب چونکہ ہم لوگوں کی دسترس میں میر انیسؔ کا کلام صرف کاغذ پر لکھے ہوئے لفظوں کی صورت میں موجود ہے اور اُس کے ادا کرنے کے نمونے نہیں ہیں اِس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ اپنی مرثیہ خوانی میں میر انیسؔ کن لفظوں کو کس طرح بلکہ کس کس طرح سے ادا کرتے تھے اور مختلف نوعیت کی ادائگی سے وہ کیا کیا معنی اور کیفیت پیدا کرتے تھے اور سامعین پر اُن کے کیا اثر ہوتے تھے۔

میر انیسؔ کے کلام میں موجود لفظوں کی پیچیدہ معنوی کائنات سے قطع نظر بالکل سامنے کے اور بظاہر سیدھے سادے لفظوں کی یہاں کچھ مثالیں دینے سے اِس بحث کو مزید تقویت ملے گی کہ معمولی لگنے والے لفظ تک کو مختلف انداز سے ادا کردینے سے ایک کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے۔جیسا کہ معلوم ہے کہ ''یہ اور وہ'' کا استعمال اسمِ اشارہ اور کلمۂ فجائیہ دونوں کے لیے کیا جاتا ہے۔جیسے اسمِ اشارہ میں ''وہ میدان'' کسی میدان کی طرف اشارہ ہے اور کلمۂ فجائیہ میں میدان کی کوئی صفت دکھائی جائے گی جیسے میدان کی وسعت یا میدان کی ہیبت۔یہ دونوں لفظ بہت ہی معمولی سے ہیں لیکن متن کی خواندگی میں آکر ان کے رنگ بدل جاتے ہیں۔میر انیسؔ کے ہی کلام سے ''یہ اور وہ'' کی کچھ مثالیں دیکھیے۔مگر یہ بھی

ذہن میں رہے کہ یہ مثالیں میں اپنی سمجھ سے دے رہا ہوں یعنی یہ قیاسی مثالیں ہیں اور ان کے غلط ہونے کی پوری گنجائش ہے۔

رحم کر رحم کہ شرمندہ ہے یہ عبدِ ذلیل

یہاں شاید ''یہ'' کے اسمِ اشارہ ماننے میں کوئی بحث نہیں ہے۔اسی طرح بغیر کسی پیچیدگی کے کلمۂ فجائیہ کی مثال کے لیے اگلا مصرع دیکھیے:

اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدحِ شبیر

لیکن یہی معمولی سا لفظ دو طرح کے تاثر دے کر ابہام بھی پیدا کر سکتا ہے:

تھا یہ بپھرا ہوا عباس مرا شیرِ جواں

یہاں ''یہ'' اسمِ اشارہ ہے یا کلمۂ فجائیہ۔یا شاید دو طرح سے پڑھنے پر اِس سے دو الگ اثر پیدا ہوتے ہیں؛ یہ میرا عباس اور یہ بپھرا ہوا۔ بہت زیادہ بپھرا ہوا۔''یہ'' کی طرح ہی ''وہ'' کا معاملہ بھی دلچسپ ہے۔

وہ غنی ہے کہ ہے محتاج زمانہ اُس کا

یہاں ''وہ'' کے اسمِ اشارہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں ہونا چاہیے۔اب ''وہ'' کا استعمال بطور کلمۂ فجائیہ دیکھیے:

مثلِ خورشید ہے روشن وہ شرف اِن کا ہے

یہاں ''وہ شرف'' سے مراد اعلیٰ شرف ہے۔''یہ'' کی طرح معمولی سا لفظ ''وہ'' بھی اسمِ اشارہ اور کلمۂ فجائیہ دنوں کا تاثر دے کر کچھ ابہام پیدا کر دیتا ہے جیسے:

وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگارگوں کی شان

اِس مصرعے میں ''وہ'' دوبارآیا ہے۔اب کس کو اسمِ اشارہ بنایا جائے اور کس کو کلمۂ فجائیہ، یہ ذرا مشکل بات ہے۔اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ میر انیسؔ کی خواندگی کے نمونے نہیں ہیں صرف اُن کی خواندگی کے بیان ہم تک پہنچے ہیں۔اِسی طرح کا ایک بیان اس مصرعے کے سمجھنے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔شادؔ عظیم آبادی نے یہ مصرع میر انیسؔ کو پڑھتے ہوئے دیکھا تھا، اُن کا بیان ہے:

''وہ دشت'' کو سریلی آواز سے ایسا کھینچا کہ وسعت دشت کی آنکھوں میں پھر گئی۔

اِس بیان سے صاف ہو رہا ہے کہ میر انیسؔ نے 'وہ دشت' کے ''وہ'' کو بطور کلمۂ فجائیہ ادا کیا تھا۔میر انیسؔ کے کلام میں ''یہ'' اور ''وہ'' کا استعمال بہت ہوتا ہے اور اکثر ایک ہی مصرعے میں ساتھ ساتھ، جیسے:

یہ وہ بندے ہیں کہ اللہ پہ حق جن کا ہے

''یہ'' اور ''وہ'' جیسے معمولی لفظ کی اِن مثالوں کے دیکھنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مختلف معنویت کے لنگر دار لفظوں کا میر انیسؔ کس مہارت سے استعمال کرتے ہوں گے۔اِس پر مستزاد یہ کہ خواندگی میں بعض مقام پر صرف چہرے کے بھاؤ، ہاتھ کے اشارے یا لفظوں کے درمیان خفیف سا وقفہ دینے تک سے معنی اور کیفیت میں تنوع پیدا کرنے کی گنجائش ہوتی ہے اور یہ تمام باتیں مرثیہ خوانی کے فن کا اہم جز بھی ہیں۔میر انیسؔ مرثیہ خوانی کے فن کی اِن جزئیات کا استعمال اِس فنکاری سے کرتے تھے کہ اُن کو مرثیہ خوانی کا بہترین فنکار تسلیم کیا جاتا تھا۔مگر یہاں بھی وہی معاملہ ہے کہ میر انیسؔ کی باکمال مرثیہ خوانی کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ جس میں ہم دیکھیں کہ وہ ہاتھ، آنکھ کے اشارے،

آواز میں تبدیلی، اورلفظوں کے درمیان دینے والے وقفوں سے کیسے کام لیتے تھے۔ اِس کے علاوہ کاغذ پر لکھے ہوے متن اور اُس کی معنوی کائنات کے ساتھ ایک خلا کی دنیا بھی ہے اور یہ جگہ خواندگی کا کمال دکھانے کے لیے زرخیز ہے کہ جہاں متن سے ماوراچیزوں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار میر انیسؔ نے یہ مصرع پڑھا:

صحرا زمردی تھا پھرہرے کے عکس سے

اِس کی ادائیگی میں میر انیسؔ نے مرثیے والے ہاتھ کو اِس طرح سے جنبش دی کہ سامعین کو پھرہرے کا لہرانا دکھائی دیا جبکہ اصل مصرعے کے متن میں لہرانے کا مفہوم ادا کرنے والا لفظ موجود نہیں تھا۔

متن کی اِن خلاؤں کی اہمیت کا سمجھنا اور اِن کی تخلیق کرنا فن کے کمال میں شمار ہوتا ہے۔ ایسے میں متن کو تخلیق کرنے والا اگر خود ہی اُس متن کے ادا کرنے والا بھی ہے تو اپنے تخلیقی عمل کے دوران وہ نہ صرف اِس خلا کو تخلیق کرے گا بلکہ اِس خلا سے کیسے کام لینا ہے اُس پر بھی نظر رکھے گا۔ ظاہر ہے فنکار کا اِس خلا سے بے حد نازک رشتہ ہوتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ فیض آباد کے ایک ذاکر غلام عباس نے میر انیسؔ سے جب اُن کا مرثیہ اپنی خواندگی کے لیے مانگا تو میر انیسؔ نے یہ کہہ کر مرثیہ دینے سے انکار کر دیا کہ: ''قبلہ اپنے کلام کو جیسا مصنف ادا کر سکتا ہے دوسرا کیا ادا کرے گا۔'' یہاں کلام کی ادائگی سے میر انیسؔ کی مراد یہ نہیں تھی کہ کاغذ پر لکھے ہوے لفظوں کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کر دیا جائے بلکہ اُن کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کلام کی تخلیق کے دوران اُنھوں نے معنی، اثر، اور کیفیت کی جو کائنات اپنی خواندگی کے لیے رچی ہے اُس تک دوسرا کیسے پہنچ سکتا ہے اور خاص اُس جگہ تک کہ جس کا تعلق خلا والی دنیا سے ہے۔

یہاں یہ نکتہ ایک بار پھر دہرا لینا مناسب ہوگا کہ میر انیسؔ اپنے کلام کو دوسروں کے پڑھنے کے لیے یعنی قاری کے لیے تخلیق نہیں کرتے تھے بلکہ بذاتِ خود اُس کلام کو سامعین تک اپنی خواندگی کے ذریعے پہنچاتے تھے۔ اِس پورے تناظر میں میر انیسؔ کے مقام کا تجزیہ کس نوعیت کا ہوگا جبکہ ہم تک اُن کا کلام کاغذ پر لکھے ہوے لفظوں کی صورت میں پہنچا ہے وہ بھی غلطیوں کے ساتھ۔ یہ غلطیاں بھی کئی طرح کی ہیں۔ مثال کے لیے یہاں دو قسم کی غلطیوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ پہلی قسم میں متن کی تدوین اور کتابت کی وہ غلطیاں آتی ہیں کہ جن سے کلام کا مطلب مجروح ہو جاتا ہے اِس لیے یہ غلطیاں ذرا آسانی سے نظر آ جاتی ہیں۔ دوسری قسم کی غلطیاں وہ ہیں کہ جو قلمی مخطوطات سے مطبوعہ نسخے کے ملانے پر سامنے آتی ہیں ورنہ تو اِن سے نہ کلام کا مطلب مجروح ہوتا ہے اور نہ ہی شعریات کا کوئی پہلو ضم ہوتا نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ دوسری قسم کی غلطیاں زیادہ سنگین ہیں۔ اِس قسم کی غلطیوں کی دو مثالیں دیکھیے جن کی نشاندہی نیر مسعود نے کی تھی:

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں

اِس میں کسی کھٹک کا محسوس ہونا تو دور یہ خاصا رواں مصرع ہے مگر قلمی مخطوطے کے مطابق میر انیسؔ نے یوں کہا تھا:

جنگل کی وہ ہُو اور درندوں کی صدائیں

دوسری مثال:

اک پیٹتی تھی ایک لپٹتی تھی قدم سے

قلمی مخطوطے میں یہ مصرع یوں ہے:

اک ہٹتی تھی اور ایک لپٹتی تھی قدم سے

متن کے نقل کرنے میں اِس قسم کی غلطیوں کے در آنے کا نتیجہ یہ ہے کہ میر انیسؔ کے مطبوعہ کلام کے متعلق پورے اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا ایک ایک لفظ وہی ہے جو میر انیسؔ نے نظم کیا تھا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اپنی نگرانی میں کتابت کروانے اور چھپوانے پر بھی عموماً غلطیاں رہ جاتی ہیں نہ کہ میر انیسؔ کا کلام اُن کی وفات کے بعد شائع ہوا تھا یعنی طباعت کے کسی مرحلے میں میر انیسؔ شامل نہیں تھے۔ یہی نہیں، طباعت کے لیے مرثیوں کے جمع کرنے میں اور مرثیوں کی کتابت کی ہوئی کاپیوں کے دیکھنے میں نول کشور پریس نے نہ تو میر انیسؔ کے کسی بھائی سے رجوع کیا نہ بیٹوں سے جبکہ یہ حضرات مرثیہ گو بھی تھے اور مرثیہ خوان بھی تھے اور لکھنؤ میں ہی موجود تھے۔

مرثیے کے متن کی صحت کے حوالے سے اِس قدر پیچیدگیوں کے علاوہ کئی جگہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ کی صحت کے متعلق بھلے ہی کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو مگر اِس بات کا طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اِس لفظ کو میر انیسؔ نے یوں ادا کیا ہوگا یا اِس طرح پڑھا ہوگا۔ مثال کے طور پر اردو کے لکھنے میں پرانے وقتوں سے یہ قاعدہ چلا آ رہا ہے کہ زیر زبر پیش نہیں لگایا جاتا جس کی وجہ سے بعض دفعہ معاملہ کچھ اُلجھ سا جاتا ہے۔ میر انیسؔ کے یہ چار مصرعے دیکھیے کہ جہاں ''اِس'' اور ''اُس'' کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے لہٰذا نہیں معلوم کہ اصلاً یہ مصرعے کس طرح سے ادا کیے گئے تھے:

اس ضرب میں ہاتھ اس کا اڑا اور سپر اس کی
دو تھا جو سر اس کا تو جدا تھی کمر اس کی
اس کو خبر اس کی تھی نہ اس کو خبر اس کی
کی موت نے دعوت ادھر اس کی ادھر اس کی

اِس پوری بحث سے دو نکتے شاید خاصے واضح ہو رہے ہیں کہ میر انیسؔ کے مستند کلام کی غیر موجودگی میں اُن کی شعریات کے بہت سے پہلو پردے میں ہیں اور یہ مخفی پہلو کبھی سامنے آ بھی نہیں سکتے اِس لیے اُن کی شعری استعداد کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ پہلو کہ جس کا تعلق میر انیسؔ کی مقبولیت کا منبع ہے یعنی اُن کی مرثیہ خوانی، اُس تک پہنچنا تو ناممکنات میں سے ہے کیونکہ اُس کی ایک بھی مثال موجود نہیں ہے لہٰذا اُن کی خواندگی کا بھی تجزیہ کر کے صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اِس سب کے باوجود میر انیسؔ کو اردو ادب کا ایک باکمال شاعر اور باکمال مرثیہ خوان تسلیم کیا جاتا ہے۔ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اِس قسم کا پیراڈاکس اعظیم فنکاروں کا ہی امتیاز ہوتا ہے۔

❀❀❀❀

www.emarsiya.com

دنیا کی سب سے بڑی ڈیجیٹل مرثیہ لائبریری جہاں آپ انیسؔ و دبیرؔ کے مکمل مطبوعہ مراثی کے علاوہ ۲۵۰ مرثیہ نگاروں کے ۳۰۰۰ سے زائد مراثی حاصل کر سکتے ہیں۔ سوزخواں خواتین وحضرات کے لیے بستۂ سوزخوانی کا بھی انتظام ہے۔ اگر آپ مزید مراثی اس ویب سائٹ پر شامل کرنا چاہیں تو اس ای میل پر رابطہ کریں۔

faroghemarsiya@gmail.com

غیر مطبوعہ مرثیہ ''اسیری''

فدا محمد ناشادؔ

یارب مری زبان میں حُسن کلام ہو میرا ہر اِک سخن بہ صداقت تمام ہو
باتیں ہوں دلنشین جو مقبولِ عام ہو (۱) شعرائے اہلبیتؑ میں میرا بھی نام ہو
اپنی متاعِ فکر کو میں عام کر سکوں
اگلی حیات کے لیے کچھ کام کر سکوں

مولا کی مجلسوں میں شراکت نصیب ہو اہل عزا کو جو ہے شرافت نصیب ہو
کوتاہیوں پہ مجھ کو ندامت نصیب ہو (۲) پُر لطف زندگی ہو شہادت نصیب ہو
میں ہوں گناہگار ، ہوس کا اسیر ہوں
لیکن ترے حبیبؐ کے در کا فقیر ہوں

مدّاح اہلبیت ہوں ، یہ ہے مرا شرف ہو ذکرِ پنجتنؑ سے زباں تر ، مرا ہدف
ادنیٰ سے اِس کلام کا تحفہ لیے بکف (۳) حاضر ہوا ہوں دَر پہ ترے یا شہِؑ نجفؑ
میری سخنوری کو اجابت عطا کریں
شعروں کو میرے جوشِ بلاغت عطا کریں

شیرِ خداؑ کا دل جو و دلبر حسینؑ ہے خیر النسؑا کی گود کا گوہر حسینؑ ہے
قولِ رسولؐ ہے ، مرا ہمسر حسینؑ ہے (۴) کرب و بلا میں ثانئ حیدرؑ حسینؑ ہے
ناناؐ کا دیں پناہ ، امامِ مبیں حسینؑ
آیا ہے نینوا میں وہ بنیادِ دیں حسینؑ

ظلمت کے بادلوں کو ہٹانے کے واسطے جگ کو اصول دین سکھانے کے واسطے
اسلام کو حیات دلانے کے واسطے (۵) باطل کی قوتوں کو مٹانے کے واسطے
حق کا وقار ، دین کی عظمت حسینؑ ہے
اسلام جاوداں ہے ، ضمانت حسینؑ ہے

جب کربلا میں سبطِ پیمبرؐ ہوئے شہید ارض و سما لرز اُٹھے آندھی چلی شدید
سورج گہن میں آ گیا ظلمت ہوئی مزید (۶) ممکن نہیں تھا ہو سکے اِک دوسرے کی دید
پُر سوز اک فضا رُخِ عالم پہ چھا گئی
ایسے میں ذوالجناح کی آواز آ گئی

بالی سکینہؑ کو ملی رہوار کی خبر خیمے سے وہ نکل پڑی بالوں کو نوچ کر
دیکھا فرس کا زین ڈھلا ، سر بخون تر (۷) کہتی تھی ذوالجناح سے ، بابا گئے کدھر
سُن کر یہ ذوالجناح کے آنسو ٹپک پڑے
گویا وہ کہہ رہا تھا کہ مولا نہیں رہے

اہلِ حرم خیام سے نکلے ہیں صف بہ صف ہر ایک رو رہا تھا پریشان ملتے کف
فریاد اور فغان کی آواز ہر طرف (۸) زینبؑ کی تھی بلند صدا یا شہِؑ نجف
اَب تو مدد کو آیئے ہم ہو گئے غریب
اسباب لُٹ رہے ہیں اسیری ہے اَب قریب

کلثومؑ کہتی تھی مرا عباسؑ ہے کہاں کرب و بلا میں آج قیامت کا ہے سماں
گلشن پہ اہلبیتؑ کی ہے چھا چکی خزاں (۹) خیموں میں آگ لگ گئی اُٹھنے لگا دھواں
طرزِ طرب کے ساز بجاتے ہیں اہلِ شام
غوغائے یا حسینؑ ہے در خیمۂ امام

زینبؑ نے جا کے سیّدِ سجادؑ سے کہا خیموں میں آگ لگ گئی ہے ، وا مصیبتا
خوف و ہراس کا ہے عجب حشر اک بپا (۱۰) آئی ہوں میں امامؑ سے اَب پوچھنے کو ، کیا
جَل جائیں اِن خیام میں یا ہم نکل پڑیں
بیٹا ہمیں بتایئے کیا ہوگا کیا کریں

بیمارؑ کہہ رہے تھے کہ جاں کو بچایئے جلنا روا نہیں ہے سبھی نکل آیئے
مجھ کو سہارا دیجئے جلدی اُٹھایئے (۱۱) بابا کے ذوالجناح سے مجھ کو ملایئے
بیمارِؑ غم نے شاہؑ کے رہوار سے کہا
بابا کو میرے پانی ملا یا نہیں ملا

یہ سن کے ذوالجناح ذرا ہانپتے ہوئے دیکھا تو اُس کا سارا بدن کانپتے ہوئے
گویا یہ بے زبان تھا منہ ڈھانپتے ہوئے (۱۲) سجادؑ بے زباں کی ، زباں بھانپتے ہوئے
فریاد کرتے کہتے تھے نہرِ فرات کو
سن لو فرات تم مری اِس ایک بات کو

بابا مرا تھا عالمِ امکاں کا خوش خصال اُن سا نہ تھا جہان میں کوئی بھی پُر جلال
لختِ دلِ علیؑ تھا وہ خیرالنساؑ کا لال (۱۳) اہلِ جفا نے اُن سے کیا جنگ اور قتال
نہرِ فرات تُف ہو تمہاری روانی کو
بابا ترستے مر گئے اک بوند پانی کو

حکمِ امامؑ ، خیموں کے دَر باز کر گئے بچے نکل کے خیموں سے باہر بکھر گئے
یا جیسے مالا ٹوٹ کے موتی بکھر گئے (۱۴) سورج غروب ہو گیا تارے اُبھر گئے
دامن میں آگ لگ کے سکینہؑ تھی جاں بہ لب
دیکھا کسی کو ڈر کے کہا یا اَخی عرب

میں ہوں یتیم میری طرف تو نہ آیئے راہِ نجف مجھے تُو خُدارا دِکھایئے
دادا سے جا کے کہنا ہے ہم کو بچایئے (۱۵) بابا مرے شہید ہوئے اَب تو آیئے
اولادِ فاطمہؑ کا المناک حال ہے
بچنے کی کوئی راہ ہے گر خال خال ہے

اتنے میں اب سواروں کو کرنے لگے طلب ہو کر سوار نکلے غلامانِ بے نسب
گھوڑے دوڑائے لاشوں پہ اللہ رے غضب (۱۶) گردش میں آسمان زمیں ہل رہی ہے اَب
جو کربلا میں آلِ نبیؐ پر ہوئے ستم
تفصیل کیسے ہوگی رقم رو پڑا قلم

تاراج کو خیام کے دوڑے ہیں اہلِ شام اہلِ حرم میں شورِ فغاں یا شہِؑ انام
اسباب لوٹ لینے کی تھی سب کو اذنِ عام (۱۷) اہلِ جفا نے ظلم و ستم کر دیئے تمام
زہراؑ کی بیٹیوں کے سروں پر ردا نہیں
کِس کو پکاریں کوئی مدد کو رہا نہیں

سورج غروب ہو گیا تاریک ہے جہاں دسویں کا ماہتاب فلک پر ہوا عیاں
آلِ رسولؐ سوختہ خیموں میں ہیں نہاں (۱۸) بَن میں ہیں آلِ احمدِ مختارؐ نوحہ خواں
ہر ایک رو رہا تھا صدا الامان تھی
اہلِ حرمِ پہ شامِ غریباں گران تھی

دِن بھر کی بھاگ دوڑ سے سہمے ہوئے تھے سب خوف و ہراس سب کے دلوں میں بسا تھا اَب
جنگل میں اہلبیتؑ کے حالات تھے عجب (۱۹) صحرا کی دھوپ پیاس سے بچّے تھے جاں بلب
خیموں میں آ کے کچھ تو یتیمان گر پڑے
مایوس کچھ نڈھال تھے ، حیران کچھ کھڑے

اِتنے میں ہو گیا ہے نمودار اِک سوار رُخ پر نقاب ہاتھ میں پکڑے ہوئے مہار
زینبؑ نے جا کے روک کے بولا ، ارے سوار (۲۰) رُک جا یہاں ہیں بیکس و نادار و بے دیار
کہنے لگے سوار کہ میں ہوں ابوترابؑ
اہلِ حرم کے غم میں ہوا دِل مرا کباب

بیٹی میں آ گیا ہوں اعانت کے واسطے غربت میں آپ سب کی حفاظت کے واسطے
سہہ لیں یہ دکھ خدا کی رضایت کے واسطے (۲۱) محشر میں امتی کی شفاعت کے واسطے
غمناک ہو کے آپ نہ آہ و بکا کریں
اُمت کو بخشوانے کی ہر دَم دُعا کریں

سَر دے دیا حسینؑ نے اسلام کے لیے دینِ نبیؐ کی عزت و اِکرام کے لیے
آزادیِ بشر کی مُہم کام کے لیے (۲۲) عہدِ اَزل کے فرض کے انجام کے لیے
بیٹی تمہیں نے صَبر سے کرنا ہے اَب تمام
جانا ہے سب اسیروں کو لے کر دِیارِ شام

اِس قافلے کی قافلہ سالار آپ ہیں بیٹی ہیں فاطمہؑ کی نگہدار آپ ہیں
اِس مختصر سپاہ کی سردار آپ ہیں (۲۳) عباسؑ کی بہن ہیں علمدار آپ ہیں
روئے اگر سکینہؑ منانا ہے آپ نے
بیمار گر پڑے تو اُٹھانا ہے آپ نے

یوں کربلا میں بیت گئی شب ، ہوئی سحر کوفے کی سَمت کوچ کی جب ہوگئی خبر
نیزوں پہ سَج چکے ہیں شہیدوں کے سارے سر (۲۴) وا حسرتا ہے مقتلِ شہدا سے اَب گذر
اہلِ حرم پہ ظلم کی کچھ انتہا نہیں
اَعدا تماشہ بین ہیں شرم و حیا نہیں

غوغائے اہلبیتؑ سے محشر کا ہے سماں عالم لرز رہا ہے تو گردش میں آسماں
زنجیر بستہ جملہ یتیمانِ خستہ جاں (۲۵) بیمار کربلاؑ کے گلے میں ہے ریسماں
اُجڑا ہوا ہے دشت میں گلزارِ پنجتنؑ
شہدائے کربلا کے جنازے ہیں بے کفن

مقتل سے اب گذرنا ہے آلِ رسولؐ کو لیلیٰؑ کو اور سکینہؑ کو بنتِ بتولؑ کو
دیکھا پڑی جنازہِ شہدا پہ دُھول کو (۲۶) تپتی زمیں پہ باغِ نبوت کے پھول کو
سَر پیٹتے زمین پہ زینبؑ جو گر پڑی
بیمارِ کربلا پہ تھی مشکل کی یہ گھڑی

اہلِ حرم کو دشت میں محشر ہوئی بپا   کہتے ہیں کوئی وا ابتا کوئی یا اَخا
شدّت کی دُھوپ زینبؑ و کلثومؑ بے ردا (۲۷) ناقوں سے گر رہے ہیں یتیمانِ نینوا
اہلِ ستم خوشی کے ترانے بجاتے ہیں
غوغائے اہلبیتؑ سرِ عرش جاتے ہیں

مقتل سے اہلِ بیتؑ کا جیسے ہوا گذر   منزل ہے اَب کہاں یہ کسی کو نہیں خبر
ہاتھوں میں تازیانے لیے سارے اہلِ شر (۲۸) یارب کسی غریب کا ایسا نہ ہو سفر
نیزوں پہ ہیں رؤس شہیداں جو آفتاب
نرغے میں اہلبیتؑ خواتین بے حجاب

دشتِ وغا سے کوچ کی تیاریاں عجیب   کوفے کی سمت جانے کا لمحہ ہوا قریب
سالارِ کاروان ہے اَب زینبؑ غریب (۲۹) بیمار کربلا کی ہے حالت بہت مہیب
گھوڑے پہ بیٹھنے کی نہ اُن کو ثبات ہے
غُل جامعہ سے اُن کو نہ ملتی نجات ہے

آمادۂ سفر ہیں اَسیرانِ اہلبیتؑ   ناقوں پہ ہیں سوار یتیمانِ اہلبیتؑ
عالم لرز رہا ہے بہ گریانِ اہلبیتؑ (۳۰) مرجھا چُکا ہے آج گلستانِ اہلبیتؑ
صرصر کی چل رہی ہے ہوا کربلا میں آج
زینبؑ کی ہے صدائے بُکا کربلا میں آج

مقتل سے جب گذر گئے سہتے ہوئے ستم   شمرِ لعیں کا ظلم نہیں تھا کسی سے کم
زنجیر میں تھا جکڑا ہوا کنبہِ حرم (۳۱) بیمار کربلا کو نقاہت تھی دم بہ دم
سارے سیاہ کار رعونت میں مست تھے
آلِ عبؑا ملول تھے مقدور پست تھے

کوفے میں آج ہر جگہ تھا عید کا سماں   ہر جا تماشہ بین تھے خرسند و شادماں
اُن کو خبر نہیں تھی کہ آل نبیؐ ہیں یاں (۳۲) صدقوں کے طشت لائے برائے مسافراں
زینبؑ نے دی صدا نہیں صدقہ ہمیں قبول
صدقہ حرام ہم پہ کہ ہیں کنبہِ رسول

کوفے کے لوگ سر بہ گریبان ہو گئے   زینبؑ کا خطبہ سُن کے پریشان ہو گئے
بعضے بزرگ نادم و گریان ہو گئے (۳۳) مجمع پہ اضطراب ، پشیمان ہو گئے
ابنِ زیاد کو ہوئی اِس بات کی خبر
دربار میں بُلایا اَسیروں کو الحذر

دربار میں تھا کرسی نشینوں کا اک ہجوم جن میں تھے اہل کوفہ و یثرب بھی ، اہلِ روم
اہلِ حرمؑ کے آنے کی ہر سو مچی تھی دھوم (۳۴) واحسرتا ! کہ اہلِ حرمؑ اور یہ ہجوم
ابنِ زیاد تخت پہ مے خوار مست تھا
اہلِ حرمؑ کے سامنے عہدِ الست تھا

دربار میں جو گزری وہ کیسے کریں بیاں بچے تھے سہمے اور بڑے بھی تھے نیم جاں
مجمع پہ اِن اَسیروں کے رشتے نہ تھے عیاں (۳۵) ہر ایک کر رہا تھا بہ انداز خود گماں
آل نبیؐ پہ ظلم و ستم میں کمی نہیں
اَب اور ظلم سہنے کی ہمت رہی نہیں

کوفے سے اہلبیتؑ کا ہوتا ہے اَب گزر یاں سے دیارِ شام کی جانب ہوا سفر
بیمارِ کربلا کو نقاہت ہے الحذر (۳۶) یارب کسی غریب کی ایسے نہ ہو بسر
پیروں میں بیڑیاں ہیں رَسَن بستہ ہاتھ ہیں
ہیں درجنوں یتیم جو زینبؑ کے ساتھ ہیں

اَب کے دیارِ شام میں وارد ہوا غضب زینبؑ کے ساتھ جملہ یتیمانِ خوش نسب
اُمِ ربابؑ ، فضہؑ ، سکینہؑ سمیت سب (۳۷) بچے بلک رہے ہیں ابھی تک ہیں تشنہ لب
حُزن و ملال و رنج میں سب ہیں گرے ہوئے
پانی اگر ملے بھی تو رو کر پرے ہوئے

کلثومؑ نے شمر سے کہا تم تھے رشتہ دار کافر کے قیدیوں کا سا ہم کو دیا قرار
درخواست تجھ سے اب ہے یہی اے ستم شعار (۳۸) اِس قافلے کو ایسی کسی راہ سے گزار
انبوہ کم ہو تاکہ ملے بے ہجوم راہ
بے مقنع ہم ہیں کم پڑے افراد کی نگاہ

اپنے سپاہیوں کو بہ تکرار کہہ تو دیں شہداء کے اِن سروں کو ذرا دور تو رکھیں
تاکہ ہجومِ خلق سے ہم کچھ پرے رہیں (۳۹) یوں ہم تماشابیں کی نگاہوں سے بچ سکیں
اِس گفتگو کا شمر پہ کوئی اثر نہ تھا
ظالم کے دل میں رحم کہیں ذرّہ بھر نہ تھا

اہلِ حرمؑ دمشق میں پہنچے بہ زار زار دروازۂ قدیم پہ انبوہ بے شمار
بے پردہ اہلبیتؑ تھے، بے شرم صد ہزار (۴۰) اور ساتھ ساتھ راسِ شہیدان کی قطار
تھے کچھ تماشا بین تماشا بنے ہوئے
کچھ آ گئے تھے طشت میں صدقے لیے ہوئے

بچوں میں بانٹتے تھے کوئی نان اور کھجور
زینبؑ نے دی صدا کہ ہیں ہم کنبہِ حضورؐ
صدقہ حرام ہم پہ ہمیں رکھنا اِس سے دور (۴۱)
ہم کو اسیر کر کے پھراتے ہیں بے قصور
بچوں سے چھینتے ہوئے صدقے کے نان کو
روتے تھے دیکھتے ہوئے فرق و سنان کو

نیزوں پہ آگے آگے شہیدوں کے سارے سَر
پیچھے ہیں اہلِ بیتِ نبیؐ پیٹتے جگر
گھوڑوں سے تازیانے گھماتے ہیں اہلِ شَر (۴۲)
غوغائے یا حسینؑ کی فریادِ پُر اثر
وا حسرتا ستم پہ ستم اہلِ بیتؑ پر
رنج و الم قدم بہ قدم اہلِ بیتؑ پر

سبطِ نبیؐ حسینؑ کا سر ہے سنان پر
مولا علیؑ کا نورِنظر ہے سنان پر
عباسؑ نامور کا بھی سر ہے سنان پر (۴۳)
ننھا سا اِک شہید کا سر ہے سنان پر
داخل ہوا ہے شام میں کنبہ بتولؑ کا
زہراؑ کی بیٹیوں کا ہے ، آلِ رسولؐ کا

چشمِ رسا سے دیکھیے بازارِ شام ہے
ہر اک گلی میں کوچے میں انبوہِ عام ہے
ضعف و تکاں سے چُور وہ چوتھا امامؑ ہے (۴۴)
کوٹھوں پہ اور چھتوں پہ بھی اک اژدہام ہے
تھک کر زمیں پہ بیٹھتے لیکن نہیں مجال
یارب کہیں قریب نہ ہو وقتِ اِرتحال

وہ ہیں تماشہ بین ، یہ کنبہ نبیؐ کا ہے
ناقوں پہ دِل اُداس یہاں ہر کسی کا ہے
چابک بہ دست ، جور و ستم ہر شقی کا ہے (۴۵)
زنجیر بستہ قافلہ آلِ علیؑ کا ہے
بے حال ہیں تمام اسیرانِ کربلا
افسردہ دِل گرفتہ یتیمانِ کربلا

زینبؑ کا ہے خطاب ، تو روشن ہوئے چراغ
بازارِ شام لحنِ علیؑ سے تھا باغ باغ
سارے عدو کے ہو گئے حیرت زدہ دماغ (۴۶)
باتوں سے اُن کی جادۂ حق کے ملے سراغ
تاریخِ کربلا جو نمایاں کر دیا
ہر اِک نے رو کے چاک گریبان کر دیا

زینبؑ کے اِس خطاب میں اک انقلاب تھا
تاریخِ کربلا کا یہ دل سوز باب تھا
ہر اہلِ شام شرم سے اَب آب آب تھا (۴۷)
ظلم و ستم کا قصہ یہاں بے نقاب تھا
فریادِ یا حسینؑ کی آواز تھی بلند
ہر لمحہ ہو رہی تھی یہ آواز اَب دو چند

اِس حال کی یزید کو جب ہو گئی خبر دربار میں بلایا اَسیروں کو ننگے سر
زنجیر بستہ اہلِ حرم ، آہ الحذر (۴۸) سہمے ہوئے تھے بچّے کہ کیسے ہو اَب گُذر
سَب بیبیاں جھجکتے ہوئے اور بے رِدا
پہنچے ہیں بزمِ عام میں یوں آلِ مصطفیٰؐ

گردِش یہ آسمان کی ہے تخت پر یزید پردے میں آل ہند ہیں محفل ہے مثلِ عید
سونے کے طشت میں ہے سرِ سیّدِ شہیدؑ (۴۹) خزراں کی چوب ہاتھ میں لیتے ہوئے پلید
کہنے لگے کہ بدر کا یہ انتقام ہے
ہم نے سجایا اِس لیے دربارِ عام ہے

سُن کر یہ بات عابدِ بیمارؑ نے کہا اے اہل شام ہم ہیں سبھی آلِ مصطفیٰ
نازِل ہوا ہمیں پہ ہی قرآں میں ہل اتیٰ (۵۰) اِعزاز میرے جد کا ہے مشہور لا فتیٰ
بابا مرا ہے سبطِ رسولِؐ خدا حُسینؑ
اُن کو شہید کر کے لیا بدلہِ حنین

ہم کو اسیر کر کے یہاں لے کے آئے ہیں زہراؑ کی بیٹیوں کو سرِ عام لائے ہیں
بچوں کو تشنہ لَب بہ پیادہ پھرائے ہیں (۵۱) ہم پہ جو بے شمار ستم تُم نے ڈھائے ہیں
کیا تُم نے اب تلک جو کیا ہے خطا نہیں ؟
اَب بھی تمہارے رُخ پہ ذرا بھر حیا نہیں

طشتِ طلا میں سر ہے یہ سبط رسولؐ کا حیدر کے نورِ عین کا ، پورِ بتول کا
شاہؑ اُمم کا گلشنِ جنت کے پھول کا (۵۲) چہرے پہ شائبہ نہیں تجھ کو ملول کا
جس کے لیے حضورؐ نے سجدہ کیا تھا طول
حکمِ خدا سے تھا ، نہ فقط مرضیِ رسولؐ

جِس فرق پر اشارہ تمہیں کر رہے ہو اَب زہراؑ نے اس کو گود میں پالا ہے با اَدب
احمدؐ نبی تو بوسہ لیا کرتے تھے بہ لب (۵۳) اَے بد نصیب تجھ پہ ہو اللہ کا غضب
ہم کو اسیر کر کے پھرایا ہے کُو بکو
بے پردہ اہلبیتؑ ہیں مجمعے کے رُو برو

ظالم یہ خطبہ سنتے ہی غصے میں آ گیا جلاّد کو اُسی جگہ فوراً بلا لیا
اہلِ حرم پہ خوف کا بادل سا چھا گیا (۵۴) زینبؑ نے اپنے پاس ہی عابدؑ بٹھا دیا
کہنے لگی یزید سے پھر اے ستم شعار
عابدؑ ہی رہ گیا ہے ہمیں ایک پاسدار

اِن کا بھی خوں بہانے کا گر عزم ہے کہیں
ہم انتقام کرب و بلا لیں گے پھر یہیں
شہزادیِ حجاز ہوں کمزور میں نہیں
عابدؑ امامِ وقت ہے حیدرؑ کا جانشیں (۵۵)
اب تک تمام ظلم تو برداشت کر لیے
کیا تشنگی بجھاؤ گے اب اِس کا سر لیے

اُس سنگدل کے دِل پہ اثر کر گئی یہ بات
سورج غروب ہو گیا اَب چھا رہی ہے رات
اہلِ حرم کو طوق و رَسن سے ملی نجات
زندان کے خرابے میں ہونے لگی حیات (۵۶)
زندانِ شام اہلِ حرم کی قیام گاہ
بے چھت مکان ہے ، تو بچھونا نہیں ہے آہ

ٹھوکر سے اپنی تختِ شہی کو گرا دیا
حلقہ بنا کے بیٹھے ہیں چوں مجلسِ عزا
فریاد یا حسینؑ ، کوئی کہتے تھے یا اَخا
سَب سے جدا سکینہؑ کی فریاد اور بُکا (۵۷)
کربل سے شام تک اُنہیں رونے نہیں دیا
زنداں میں بھی سکینہؑ کو سونے نہیں دیا

دِل سوز و دل فگار یہ زنداں کے روز و شب
کِس کو خبر یہاں سے رہائی ملے گی کب
ضعف و تکاں سے بالی سکینہؑ ہے جاں بلب
بیمارِ کربلاؑ کو نقاہت بڑھی ہے اَب (۵۸)
بچے بلک رہے ہیں کہ یہ اپنا گھر نہیں
گھر لوٹنے کی آس بھی اَب عمر بھر نہیں

بَس ہو چکا ہے اہلِ حرمؑ کا سفر تمام
باقی رہے خرابۂ زنداں کے صبح و شام
زینبؑ سمیت قافلۂ شام پر سلام
ناشاؔد پر نگاہِ کرم یا شہؑ انامؑ (۵۹)
یہ ہدیۂ حقیر اسیروں کے نام ہے
مولاؑ کریں قبول ، شہیدوں کے نام ہے

اشاریۂ انیسؔ
(زیرِطبع)
اصغرمہدی اشعر

اشاریۂ دبیرؔ
(زیرِطبع)
اصغرمہدی اشعر

سلام نگاری
کلام میر نفیسؔ کے آئینے میں

مولانا دلکشؔ غازی پوری

اردو شاعری پر اگر بات کی جائے تو ہر عہد میں غزل کو یہ فوقیت حاصل رہی ہے کہ سارے ناقدین اور مبصرین نے اسے گلے لگایا ہے، اگر دو نے تنقید کی ہے تو دو ہزار نے ستائش کے قلعے تعمیر کر دیئے ہیں۔ اس کے بعد نظم پر زور دیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ مولانا الطاف حسین حالیؔ کا زورِ بیان ہی تھا جس کی وجہ سے ایک زمانہ غزل سے صرف نظر کر کے دوسری اصناف سخن کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ساتھ ہیئت پر لوگوں نے خوب زور دیا، مثلاً غزل اور نظم کے بعد قطعہ، رباعی، مستزاد، ہائیکو، سائنٹ اور مثنوی وغیرہ پر نگاہ ڈالی گئی۔ اور ان کے مصائب ومحاسن پر بھی قلم اٹھایا گیا۔ ایک زمانے تک تو مرثیہ بھی ایسی صنف سخن رہا، جس پر غور کرنا گویا مذہبی زبان میں حرام تھا۔ بڑے سے بڑا کیا چھوٹا ناقد یا مبصر ہو، اس صنف کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مقولہ بن گیا تھا کہ ’’بگڑا شاعر مرثیہ گو‘‘ اس کی وجہ کیا تھی اور یہ کیوں کہا گیا؟ تو ایسا نہیں ہے کہ مرثیے اس قابل نہیں تھے کہ ان کو دیکھا اور پرکھا نہیں جا سکتا تھا، بلکہ اس کی خاص وجہ تھی، اور وہ ادبی نہیں مذہبی تھی چونکہ مرثیے کا سیدھا تعلق حضرت امام حسینؑ سے تھا۔ اور امام حسینؑ کا تعلق شیعیت سے مانا جاتا ہے۔ اس لیے وہ ناقد ومبصر جو شیعہ نہیں تھے انہوں نے اس صنف کی طرف مذہبی مجبوری کے سبب دیکھنا گوارا نہیں سمجھا بلکہ گناہ تسلیم کیا اور وہ مبصرین وناقدین جو مسلکاً شیعہ تھے انہوں نے اِس وجہ سے قلم نہیں اُٹھایا کہ کہیں ان پر شیعیت کا ٹھپہ نہ لگ جائے اور ان کی ترقی مسلکی تعصب نہ حائل ہو جائے۔ وہ تو بھلا ہو میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کا جنھوں نے اس صنف کو اردو ادب کے سانپ کے گلے کا چھچھوندر بنا دیا کہ نہ اگلتے بنا نہ نگلتے۔ مجبوری میں لوگوں نے اس طرف توجہ دی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ انیسؔ و دبیرؔ کی ہمالہ صفات شخصیت اور جلیل القدر شاعری نے ناقدین کا قلم پکڑوا کر اپنی شخصیت وشاعری پر کچھ نہ کچھ لکھنے کے لیے مجبور کر دیا اگر آپ میری بات کا ثبوت مانگیں تو میں کہوں گا کہ آج کوئی ایسا ناقد ہے جس نے آج کے قصیدوں یا مرثیوں پر نظر ڈالی ہے، اسے پرکھنے اور اس میں موجود محاسن ومصائب پر گفتگو کی ہے۔ کل کے ذوقؔ، سوداؔ، غالبؔ اور محسنؔ کاکوروی جیسے چند شعراء کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے کلام کو دیکھا اور پرکھا گیا۔ پھر اللہ اللہ، خیر سلا۔

اگر عہد حاضر کی بات کریں تو ایسے ایسے شعراء کی غزلوں پر زمین آسمان کے قلابے ملانے والے صاحبانِ قلم کو غزل یا ہیئتی تبدیلی کے ساتھ انہیں مضامین کو پیش کرنے والے شعراء کے علاوہ کوئی اور شاعر ہی نظر نہیں آتا۔ میں نے جو بات کہی ہے کہ اس بے اعتنائی کی وجہ اکثر ناقدین کا غیر شیعہ ہونا ہے اور شعبہ ناقدین اس لیے آگے نہ بڑھ سکے کہ وہ ڈرتے تھے کہ مجھ پر مذہب پرستی کا ٹھپہ نہ لگے جائے۔ ذرا محترم ڈاکٹر رضا علی عابدی کا یہ بیان پڑھیے وہ سلام اور نوحے پر ناقدین ومبصرین کے تفصیلی تجزیاتی مطالعہ سے دور رہنے کی وجہ لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی وجہ:

''دین میں تفریق نہیں بلکہ ذوق کی کمی ہوسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جہاں بہت سی متروک اور غیر متروک اصنافِ سخن پر کچھ نہ کچھ لکھنے کا عمل جاری ہے وہاں سلام اور نوحے جیسی قدیم صنفِ شاعری پر کوئی توجہ نہیں دی گئی، جب کہ اُردو کے رثائی ادب میں مراثی کے علاوہ سلام اور نوحوں کا بڑا ذخیرہ ہمیں دعوتِ غور وفکر دے رہا ہے، اور ہم ہیں کہ غزل کی طلسماتی دنیا سے باہر نکلنے پر آمادہ نہیں (رشحاتِ قلم، وسیم ہاشمی ص ۱۸۵)

اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہ انہوں ''ذوق کی کمی'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ عابدی صاحب بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتے کہ یہ بے اعتنائی کیوں کہ اور اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ میں نے آج سے بہت پہلے بھی لکھا تھا کہ اردو ادب میں بھی ایک طرح کا تعصب تھا، ہے اور اس وقت تک رہے گا، جب تک ہم کلامِ منظوم یا منثور کو کلام کی بنیاد پر پرکھنے کا عمل نہیں شروع کریں گے۔ شخصیت، قرابت، علاقہ داری اور مذہب ومسلک جب تک پیش نظر رہیں گے ادب کا بھلا نہیں ہوگا۔ ہاں کسی انسان کا ذاتی بھلا ہو رہا ہے تو یہ بات اور ہے۔

آیئے اب میں آپ کو ایک ایسی ہی صنفِ سخن کی طرف لے چلوں ناقدین ومبصرین کی اس کوتاہ بینی کا شکار ہے جو انہیں مذہب یا مسلک کے حصار سے باہر نہیں دیتی۔ اور وہ صنف ہے سلام۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر کوشش ضرور ہوگی کہ اس بہانے سلام نگار شعراء تک قارئین کی رسائی ہو جائے۔ اور وہ بھی دیکھیں کہ کیا اس صنفِ سخن میں غزل جیسی وسعت، رعنائی، لطافت، ہمہ گیری نہیں ہے۔ اور کیا یہ صنف صرف اس لیے ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جائے کہ اس میں حضراتِ اہلبیتؑ کرام، اور شہدائے کربلا سے محبت وعقیدت یا ان کی سیرت واخلاق کا بیان ہوتا ہے۔ اگرچہ حضرت شارب رودلوی نے اس کے لیے ایک عذر پیش کیا ہے اور لکھا ہے۔

''اس صنف سلام کو ہنوز کوئی حالیؔ یا شبلیؔ نہیں ملا، جو اس کی تاریخ یا ادبی قدروں کے تعین کی کوشش کرتا۔''

(انیس کے سلام۔ص ۳۸۵۔ ناشر اردو اکیڈمی، دہلی)

میں اس وقت قارئین کرام کے سامنے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ صنفِ سلام بھی غزل کی طرح ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ہر طرح کے خیال کی سمائی ممکن ہے۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ غزل میں جب بات عشق ومحبت کی ہوتی ہے تو بقولِ غالبؔ کہنا پڑتا ہے کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں عشقِ حقیقی کو بھی عشقِ مجازی کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ یا مسائلِ حیات کو بھی یوں بیان کرتے ہیں:

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

گویا غزل میں ہر طرح کے خیالات، رنگارنگ تخلیقات کے ساتھ کھردری باتیں اور خشت وسنگ جیسے موضوعات نظم کیے جاسکتے ہیں تو صنف سلام بھی ان سب باتوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہاں شرط صرف یہ ہے کہ یہاں لہجہ متین ہی نہیں مقدس، الفاظ نہایت شائستہ اور تخئیل کو پاکیزہ رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ غزل کی شاعری کی طرح سلام کے شاعر کا محبوب فانی اور صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ اس صنف کا مرکزی ہیرو یا کردار وہ ہوتا ہے جو آفاقی ہے۔ سننے والوں کے دماغ میں جس کی سیرت لاثانی ہوتی ہے۔ اسی لیے

صنفِ سلام کا شاعر شعر کہتے وقت بہت محتاط ہوتا ہے اور تخئیل کے ساتھ زبان سے نکلنے والے یہ صنف آبِ کوثر سے دھلی ہوتی ہے۔

اتنی گفتگو کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صنفِ سلام یوں تو دنیائے تشیع میں معروف و ہر دلعزیز صنف سخن رہی ہے اور رہے گی۔ یہاں مذہبی شاعری کرنے والے ہر شاعر نے اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ دکن سے لے کر دلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور بنگال تک کوئی ایسا شاعر مذہبی نہیں ملے گا جس کی ڈائری میں سلام نہ ہو، مذہبی شاعر کیا غزلوں کے شعراء بھی اس سمت متوجہ ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل دنیائے شیعیت میں اقبالؔ اشعر کا ایک شعر بہت گردش کر رہا ہے بلکہ زبان زد ہو چکا ہے:

سر پٹکتی ہوئی موجوں کو تلاطم نہ کہو
یہ تو دریاؤں کا اندازِ عزاداری ہے

غزل کہنے والے کہیں گے کہ یہ غزل کا شعر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ شعر ھذا صنفِ سلام سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر چہ اقبال اشعر اسے غزل اور سلام دونوں طرح پڑھتے ہیں۔

صنف سلام میں جہاں ایک طرف رسولؐ خدا، حضرت علیؑ، جناب فاطمہؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، حضرت عباسؑ حضرت علی اکبرؑ، حضرت علی اصغرؑ، حضرت قاسمؑ، حضرت عونؑ و محمدؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، حرؑ، جونؑ، سعیدؑ، زہیرؑ، جناب زینبؑ، جناب اُم کلثومؑ، جناب لیلیٰؑ (مادرِ علی اکبرؑ)، جنابِ ربابؑ (مادر علی اصغرؑ) اور جناب سکینہؑ کا ذکر ہوتا ہے ان کا عزم ان کا حوصلہ، باطل کے خلاف جوش اور حق کی حمایت میں مستحکم ارادے کا بیان ہوتا ہے۔ وہیں ان سے متعلق اشعار میں ایسی باتیں بھی بیان کی جاتی ہیں جو سماج اور معاشرے کے لیے ناسور بنتی ہیں۔ مثلاً آج سب نہیں ہاں زیادہ تر دنیا یہ چاہتی ہے کہ عورت بے پردہ ہو جائے۔ مگر وہ گھرانے جو وضع دار ہیں۔ جن میں غیرت ہے، بے غیرتی و بے حیائی جن تک نہیں پہنچی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے گھر کی عورت بے پردہ نہ رہے۔ اب اگر ایک غزل کا شاعر ہوتا تو یہی کہتا۔

بے پردگی نے چھین لی چہرے سے رونقیں

مگر صنفِ سلام کا شاعر جب سماج کو بے پردگی سے بچنے کا پیغام دیتا ہے تو وہ کردار حضرت امام حسینؑ اور جناب زینبؑ کو بنیاد بناتے ہوئے کہتا ہے۔

زینبؑ کو دمِ نزع صدا دیتے تھے شبیرؑ
نکلو نہ بہن پردے سے باہر مرے آگے

یا اگر کسی کا گھر لٹ رہا ہو تو وہ جو انداز بیان اختیار کرے گا، اس کی ترجمانی کتنے سلیقے سے کی گئی ہے یہ دیکھئے۔

لوٹنے آئے جو اعدا تو یہ فضہؑ نے کہا کیا قیامت ہے ارے خوفِ خدا کچھ بھی نہیں
گھر میں ناموس محمدؐ کے در آئے ہے ہے تم کو محبوب الٰہی سے حیا کچھ بھی نہیں

جنابِ فضہؑ اگر چہ خانوادۂ اہلبیتؑ کی کنیز تھیں مگر معاف فرمائیے گا۔ بیتِ آلِؑ رسول میں نوکر، نوکر نہیں گھر کی ایک فرد ہوتا تھا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ فضہؑ جو کہ کنیز تھیں، انہیں جناب فاطمہؑ نے بہن مانا، حضرت علیؑ بہن کہتے ہی کہتے تھے جب کہ حضرات حسنینؑ و جناب زینبؑ و ام کلثومؑ ماں پکارتے تھے۔ اور رسولؐ خدا بیٹی کہہ کر بلاتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جناب زہراؑ نے امور خانہ داری کو یوں تقسیم کر دیا تھا کہ گھر کا سارا کام ایک دن فضہؑ کریں گی اور دوسرے دن وہ خود۔ اگر وہ فضہ کو کنیز سمجھتیں تو ہر روز گھر کا کام جنابِ فضہؑ کے

حوالے ہونا چاہئے تھا۔مگر ایسا نہیں ہوا۔اسی لیے کربلا کے میدان میں بعد قتل امام حسینؑ ؎

درانہ عدو بے ادبانہ ہوئے داخل

تو جنابِ فضہؑ نے انہیں پکارا اور فریاد کی۔اب یہ میر نفیسؔ کے انداز بیان کا کمال ہے کہ ایک پریشان حال عورت کی زبان سے ایسے لمحات میں جو فقرے نکلتے ہیں یا نکل سکتے ہیں۔وہ انہوں نے نظم کے قالب میں ڈھال دیئے۔انہوں نے یہ منظر لفظوں کے سہارے اس طرح بیان کیا کہ۔

ایک طرف بے پردگی کی وحشت وکلفت سمجھ میں آ رہی ہے

دوسری سمت رقت طاری ہورہی ہے

تیسری جانب شاعر کے کمالِ فن کا احساس ہورہا ہے

اگر غور کیا جائے تو غزل کا بنیادی موضوع عشق ومحبت کا اظہار،حسن وجمال کا تذکرہ،فراق ووصال کے افسانے وغیرہ کا بیان ہے۔یہ بات اس کے نام یعنی لفظ غزل سے بھی ظاہر ہے۔ابتدا میں یہی حال رہا چنانچہ آپ قدماء کے دیوان دیکھیے اس میں صد فیصد ایسے ہی اشعار ملیں گے جن میں حسن وعشق کا بیان،مسّی،چوٹی اور زلفوں کی گفتگو،معشوق کی پتلی کمر اور چال ڈھال کی باتیں ہوں گی۔لیکن حالی کی کوششوں سے اس کے جہان میں بھی اضافہ کر کے شعراء نے حالات زمانہ،واقعات،معاشیات،اقتصادیات،سیاسیات،قومی وملی مسائل غرض سب کچھ مہیا کر دیا۔اب اگر ہم سلام کی بات کریں تو یہ ساری چیزیں اس کے دامن میں پہلے ہی سے موجود ہیں۔میرا موضوع چونکہ صرف میر نفیسؔ کی سلام نگاری تک محدود ہے،اس لیے دوسرے شعراء کے اشعار حوالے نہیں کر رہا ہوں۔

صنفِ سلام کو اس نظر سے بھی دیکھیے کہ اس میں حسن وعشق کا تذکرہ بھی ہوتا ہے مگر میں ایک بار پھر کہہ دوں کہ یہاں محبوب فانی نہیں،روحانی وجاودانی ہوتا ہے اس لیے شعر میں بھی یہی پہلو اجاگر ہوتا ہے۔مندرجہ ذیل اشعار پڑھئے ؎

مجرئی آئینہ مہ میں صفا کچھ بھی نہیں ۔۔۔ سامنے روئے شہِ دیں کے ضیا کچھ بھی نہیں

صباحت گوہر و یاقوت وصبح وشام کی سب ہے ۔۔۔ دہن میں ہونٹ میں رخسار میں زلفِ معجز میں

چمک ہے صاحب رنگ الفت شبیرؑ و شبرؑ کی ۔۔۔ زمرد میں گہر میں لعل میں یاقوت احمر میں

بسی ہے نکہتِ گیسوئے خوشبوئے گلِ زہراؑ ۔۔۔ اگر میں مشکِ چیں میں عطر میں سنبل میں عنبر میں

فلک شمس و قمر کی روشنی کو بھول جائے گا ۔۔۔ کرے گی وہ ستارے حشر کے دن یہ زمیں پیدا

ان تمام اشعار میں کیا آپ کو حسن وجمال محبوب کا دیدار نہیں ہورہا ہے؟ ہاں یہاں محبوب مونث نہیں ہے۔بلکہ وہ ذات والا شان ہے،جسے خود محبوبِؐ الٰہی محبوب رکھتے تھے اب یہ ناقدین کا ذوق ہے کہ جس کے صدقے میں حسن وجمال خلق ہوئے،اس کے محبوب کو چھوڑ کر ان پر جان دیں۔جن کا حسن وجمال تنزل پذیر ہے۔

جیسا کہ کہتے ہیں۔یہ غزل کا ایک خاص موضوع فراق،یعنی محبوب کی جدائی میں تڑپنا اس سے بچھڑنے کے غم میں حبیب کا پریشان ہونا،تو اس مضمون سے بھی سلام کا دامن خالی نہیں ہے۔یہ اشعار پڑھئے ؎

شہِؑ کونین کو عرضی میں یہ صغریٰؑ نے لکھا ۔۔۔ گھر میں بابا الم وغم کے سوا کچھ بھی نہیں

رنج واندوہ سے اس درجہ بھرا ہے دلِ زار مجھ کو رغبت طرفِ آب و ہوا کچھ بھی نہیں
دردِ سر ہوتا ہے کم اور نہ اترتا ہے بخار روز پیتی ہوں یہ تاثیر دوا کچھ بھی نہیں
یاس بن آپ کے بیمار کو ہے جینے سے نہ مسیحا ہو تو امیدِ شفا کچھ بھی نہیں

ذرا ایک لمحے کے لیے سوچئے۔کیا جدائی میں تڑپنا، فراق میں آہ وزاری کرنا۔اس کا مطلب صرف ایک عورت سے جدائی ہوتا ہے۔کیا جب تک ایک عورت بشکلِ محبوبہ، کسی آدمی سے جدا نہیں ہوگی، ہجر کے لوازمات اکٹھا نہیں ہوں گے۔کیا یہ جذبۂ فراق ایک بھائی بہن، ایک باپ بیٹی، ایک ماں بیٹی چاہیے۔ یا اسی طرح کے دوسرے رشتوں میں نہیں ہوسکتا۔کیا باپ کی جدائی میں بیٹی، ہجر کی شدت کو محسوس کر کے اپنے تاثرات کو بیان کرے تو وہ ہمارے دلوں کو نہیں چھوسکتے۔آپ مندرجہ بالا اشعار کو دیکھئے، ان میں ایک بیٹی (صغریٰ) سے باپ (جناب امام حسینؑ) کے جدا ہونے کا بیان ہے۔آپ غور کیجیے۔بیٹی باپ کو خط لکھ رہی ہے۔اور ہر اس چیز کو بیان کر رہی ہے جو اسے اپنے بابا کی جدائی میں نہ اچھی لگ رہی ہے اور نہ اس کے لیے اچھی ہے۔معاف فرمایئے گا، غزل کا مرکزی کردار چونکہ صرف ایک عورت ہوتی ہے، وہ بھی محبوبہ کے روپ میں، لہٰذا ایسے کسی جذبے کے اظہار کا وہاں موقع ہی نہیں ہے۔اس کے لیے اردو ادب کو صنفِ سلام کی طرح دیکھنا ناگزیر ہوگا۔

اب ذرا یہ دو شعر پڑھیے۔

یوں کاکلِ اکبرؑ تھی قریبِ رُخِ تاباں جوں ابرِ سیہ ہو مہِ انور کے برابر
ثنائے گیسوئے خوشبوئے شاہِؑ دیں جو لکھتا ہوں سیاہی بن گئی ہے مشک تر کاغذ مہکتا ہے

ان دونوں میں سے پہلے شعر میں جناب علی اکبرؑ کے حسن اور ان کی زلفِ دوتا کا بیان ہے۔میں غزل کے درجنوں شعر سنا سکتا ہوں جن میں شعراء نے زلفِ محبوب کی نہ جانے کیا کیا تعریف کی ہے اور اسے نہ جانے کتنی تشبیہات سے نوازا ہے جب کہ وہ ان کی مصداق نہیں تھیں۔مگر میر نفیسؔ کے اس شعر میں دیکھیے، چونکہ یہاں محبوب وہ ہے جو ہم شکلِ پیغمبرؐ ہے، اور شاعر کا اصل ممدوح ذاتِ ختم المرسلینؐ ہے لہٰذا جب اس نے یہ کہا کہ اکبرؑ (ہم شبیہ پیغمبرؐ یعنی ایسا حسین جو بے مثل ہے) کے روئے تاباں کے نزدیک زلفِ معنبر ہے تو یہ منظر خود بخود سحر انگیز ہوگیا۔اس پر شاعر نے جب یہ کہا کہ اس منظر کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ مہِ انور کے برابر ابرِ سیاہ ہے تو یہ تشبیہ بھی بہت خوب ہے جو شعر کو نادر بنا رہی ہے۔

اسی طرح شاعر نے دوسرے شعر میں حضرت امام حسینؑ کی زلفوں کی تعریف کی ہے۔شعر ایک بار پھر پڑھیے اور یہ سمجھ لیجیے کہ حضرت امام حسینؑ کون ہیں۔اور شاعر کیوں کہہ رہا ہے کہ شاہِؑ دیں (امام حسینؑ) کے گیسو خوشبو دیتے ہیں۔کیوں کہ امام حسینؑ جہاں ایک طرف سلسلۂ عصمت کی ایک کڑی ہیں، وہیں آپ اس زہراؑ کا جز وبدن ہیں جس کی ذات عطیہ خداوندی اور نبی کریمؐ کو تحفۂ الٰہی ہے۔روایات میں یہاں تک مرقوم ہے کہ نبی اکرمؐ فرماتے تھے کہ جب میں شبِ معراج منزلِ قدس پر پہنچا تو مجھ کو معبود برحق کی طرف سے ایک جنتی سیب عطا ہوا، جسے میں نے نوش کیا، اس کی خوشبو ایسی تھی کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ویسی خوشبو کبھی نہیں سونگھی تھی۔لیکن جب زہراؑ کی ولادت ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے بدن سے اسی سیبِ جنت کی خوشبو آرہی ہے۔اب مجھے جب بھی اس سیب کی خوشبو سونگھنے کا دل کرتا ہے تو میں زہراؑ کو گلے لگا لیتا ہوں۔لہٰذا اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے گیسو بھی اسی سیب جنتی کی خوشبو کا ایک مرکز اور ذخیرہ ہے۔لیکن دیکھیے شاعر نے اپنے محبوب کے گیسو کی تعریف بس یہیں تک محدود نہیں رکھی ہے کہ وہ خوشبو دیتے ہیں۔یہ صفت تو غزل کے شاعر کے محبوب کی زلف میں بھی ہوتی ہے۔بلکہ وہ کہتا ہے کہ کہ ایسے جنت والے خوشبودار گیسو کی جب میں ثنا کرتا ہوں سیاہی مشک نہیں مشک تر بن جاتی ہے، اور اسی

وجہ سے کاغذ مہک اٹھتا ہے۔ ذرا یہ نزاکت دیکھئے کہ شاعر نے مصرعۂ ثانی میں ایک طرف مشکِ تر استعمال کیا ہے تو دوسری سمت کاغذ مہک اٹھنے کی بات کی ہے۔ کم سے کم جن لوگوں نے کلک اور روشنائی سے لکھا ہے وہ جانتے ہیں سیاہی یا روشنائی میں خود ایک بو ہوتی ہے، اس عہد میں روشنائی کو خوشبودار بنانے کے لیے گلاب وگیرہ کی پتیوں کو پیس کر اس میں ڈالتے تھے۔ اسی طرح مشک کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ اسی کی خوشبو سے جنگل مہک اٹھتا ہے۔ مگر جب لفظ ''مشک'' کے ساتھ، حرفِ لاحقہ تفصیل ''تر'' لگ گیا تو یہ اور بھی جاں فزا ہو گیا کیوں کہ مشک تو خوشبودار ہوتی ہے یہ جائے یہ کہ وہ مشک جسے ابھی ابھی حاصل کیا گیا ہو۔ تو اس کی خوشبو کتنی زیادہ ہوگی۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل میں اگر زلف کو ہوش ربا بتایا جاتا ہے تو سلام میں زلفِ ممدوح کو جاں فزا کہتے ہیں۔ اور شعراء اس کی تعریف میں غزل کی طرح صرف خیالی قلابازی نہیں کھاتے بلکہ حقیقت کا دیدار کراتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا محبوب بے مثال ہوتا ہے۔

ایک دور ایسا بھی آیا جب غزل میں شعراء نے دنیا اور اس کی بے ثباتی کا ذکر کیا میں لکھ چکا ہوں کہ ایک زمانہ تھا جب غزل کے مضامین کو لے کر علمِ احتجاج بلند ہوا تھا۔ جس کے بعد شعراء نے حالات زمانہ، غریبی، اسیری، مفلسی کے نقصانات، سماجی یا برابری، دبے کچلوں کی سربلندی اور دنیا کی بے ثباتی، مر کے بھی زندہ رہنے کی باتیں، شعر میں ڈھالنے لگے تھے، لیکن سلام کے ساتھ ایسا نہیں تھا، وہاں ایسے مضامین ابتدا ہی سے لفظوں کا جامہ پہنتے تھے، کیوں کہ صنف سلام کے سخنوروں کے ممدوح خود ھادی بھی تھے لہٰذا جب وہ اپنی گفتگو میں ایسی باتیں کرتے تھے تو ان کی باتیں کرنے والے شعراء اس سے دامن کیوں بچاتے، میر و مرزا کیا ان سے بیشتر شعراء نے بھی اس راہ کو روشن کیا۔ اور ان کے بعد آنے والوں نے چراغ کی لو کو مدھم نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ حضرت میر مونس نے ایسے بہت سے اشعار یادگار چھوڑے ہیں، جن کا مطالعہ بالیدہ کر دیتا ہے اور دل میں جذبۂ انسانیت موجزن ہو جاتا ہے۔ مثلاً

محال شے کی تمنا عبث ہے پیری میں — کہیں گیا ہوا عہدِ شباب پھرتا ہے
زمیں پہ پھرتے ہیں یوں بے ثبات زیست میں ہم — کہ جیسے پانی کے اوپر حباب پھرتا ہے
اپنی زینت کسے دکھلاتی ہے تو اے دنیا — پھیر ادھر منہ کو ادھر حرص و ہوا کچھ بھی نہیں
رہی وہ روشنی آنکھوں میں نہ وہ جسم میں طاقت — چراغ زندگانی ہوگیا آخر خموش ایسا
مثال آئینہ ہے زندگی و موت کا حال — کہ روشنی ہے ادھر اس طرف اندھیرا ہے
شب شباب گئی آئی صبح پیری کی — مآل پر بھی نظر کر ابھی سویرا ہے
یہ سرائے عاریت ہے گھر نہیں — اے مسافر خواہشِ راحت نہ کر
جو کہ دنیا سے گیا پھر اسے پانا ہے محال — غیر ممکن ہے کہ پیری میں جوانی ہوجائے

ان اشعار پر غور کیا جائے تو پہلے شعر میں شاعر نے بتایا اور مثال دے کر سمجھایا ہے کہ جس طرح شباب جا کر واپس نہیں آتا، اسی طرح کسی شئ محال کی تمنا فضول ہے۔ یہ سبق انسان کے ذہن میں رہنا لازمی ہے۔ میر صاحب نے بھی اسی مضمون کو یوں باندھا ہے

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی — ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا — جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

دوسرے شعر میں زندگی کو حباب سے تشبیہ دی گئی ہے، اور یہ تشبیہ شاید اسی وقت سے رائج ہے جب سے انسان نے بولنے کی ابتدا کی ہے۔ شاعر نے اپنے شعر میں یہی بتایا ہے کہ جو زندگی پانی کے بلبلے جیسی ہے اس کی کیا حیثیت، امیرؔ مینائی نے بھی اسی بات کو یوں بیان کیا ہے ۔

زیست کا اعتبار کیا ہے امیرؔ
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

یہاں یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ ایک نے دوسرے کی تخئیل پر تصرف کیا ہے۔ کیونکہ امیرؔ کے شعر میں آدمی اور اس کی حیات کو بلبلے سے تشبیہ دی گئی ہے، گویا شاعر انسان کو بلبلہ بتا رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ جیسے پانی پر بننے والے بلبلے کا اعتبار نہیں ہے کہ کب پھوٹ جائے، ویسے ہی حیاتِ انسانی کا بھروسہ نہیں کہ کب منزلِ آخر سے ہمکنار ہوجائے، مگر نفیسؔ کے شعر میں ایک بڑا حسین التزام ہے جو امیرؔ کے شعر میں نہیں ہے۔ اور وہ یہ کہ نفیسؔ نے بلبلے کی مناسبت سے پہلے مصرعے میں ''زمیں پہ پھرتے ہیں'' کہہ کر انسانی زندگی اور خیالوں کی حیات میں مماثلت پیدا کی ہے وہ فنکارانہ صلاحیت ہی کی عطا ہے۔ یہاں اس شعر کے سلسلے میں ان لوگوں کے لیے یہ بھی لکھ دوں جو مبتدی ہیں اور فصاحت و بلاغت سے کماحقہٗ واقف نہیں ہیں کہ یہ شعر تعقیدِ لفظی کی مثال ہے کیونکہ مصرعہ اولیٰ میں ہم ضمیر جمع متکلم بالکل آخر میں ہے، جب کہ اسے ابتدا میں ماصدر کلام میں ہونا چاہیے تھا۔ یعنی مصرعے کی نثر بنائی جائے تو یوں ہونا چاہئے تھا۔

''ہم بے ثبات زیست میں زمیں پر یوں پھرتے ہیں۔ یا۔ بے ثبات زیست میں ہم زمین پر یوں پھرتے ہیں''۔

لیکن شاعر نے ایسا نہیں کیا۔ ایسا اس لیے ہے کہ تعقیدِ لفظی اگر چہ عیب ہے اور عربی ادب اسے قبول نہیں کرتا، ہاں اردو ادب اس کی بہت قدر کرتا ہے، اور اسے حسن مانتا ہے کیوں کہ اس سے جملہ میں حسن پیدا ہوتا ہے اور کلام میں زور آتا ہے۔ آپ پہلا مصرع خود پڑھ کر دیکھیے۔ حرف ہم تک جاتے جاتے آپ کو ایک ایسی کیفیت کا احساس ہوگا جو آپ کو اپنا گرویدہ بنالے گا۔ اور یہی کمالِ شاعری ہے۔

تیسرے شعر میں شاعر نے باب مدینۃ العلم حضرت علیؑ کے ایک قول کو اپنے لفظوں میں نظم کیا ہے۔ اور دوسرے مصرعے میں اس کی وضاحت بھی کردی ہے۔ مولا علی نے فرمایا ہے کہ

یادنیا، غری غیری و قد طلقتك ثلاثا۔ اے دنیا میرے سوا کسی اور کو دھوکا دے میں نے تجھے تین طلاقیں دی ہیں۔

(طبقات اکبریٰ، ص ۳۴)

اسی تناظر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ دنیا مجھے نہ بہکا، بلکہ مجھ سے دور ہٹ جا کہ میں تیرے بہکاوے میں آنے والا نہیں ہوں۔

چوتھے شعر میں شاعر نے انسانی ایام زندگی اور اس کے بدلتے ہوئے حالات کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اور پہلے مصرعے ۔

رہی وہ روشنی آنکھوں میں نہ وہ جسم میں طاقت

میں قرآن حکیم کے اس فرمان کو لفظوں کے قالب میں ڈھالا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ وَمِنْكُمْ مَنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ''خداوندِ عالم کی قسم! وہی تمہارا پیدا کرنے والا، تم کو موت دینے والا ہے۔ اور تم میں (انسانوں میں) بہت سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو بڑھاپے کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں، جہاں (پہلے بہت کچھ جاننے کے بعد) اب انہیں کچھ بھی علم نہیں رہتا۔'' (سورہ نحل نمبر ۱۶، آیت نمبر ۷۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ آنکھوں کی روشنی رہ گئی اور نہ جسم میں طاقت۔ اب آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا، کان صاف صاف کچھ سننے سے

معذوری ظاہر کرتے ہیں۔ دماغ ساتھ چھوڑنے لگتا ہے گویا سب کچھ جاننے والا اب کچھ نہیں جانتا، بے ثباتیِ دنیا اور تغیر کیفیتِ انسانی کا بیان، کیا اس سے اچھے پیرائے میں ہوسکتا ہے۔

پانچواں شعر جہاں باعتماد بیان عمدہ ہے۔ وہیں یہ تصر اتخئیل خوبصورت ہے۔ بندش اتنی چست ہے کہ زبان بے ساختہ واہ کہنے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ شاعر نے آئینے کی حقیقت ظاہر کرتے ہوئے انسان کی زندگی اور موت اس سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس شاعر کی دیدہ وری ہے کیوں کہ آئینہ ایک طرف اجلا ہوتا ہے تو دوسری جانب سیاہ۔ ایک طرف چہرہ دکھائی دیتا ہے تو دوسری جانب کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا، یہی حال انسان کا بھی ہے۔ زندگی اس کے لیے آئینے کی وہ سمت ہے جہاں سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ موت آئینہ کی وہ سمت ہے جہاں صرف اندھیرا ہے۔ اگر اس شعر کو غزل کا شعر کہہ کر کسی ناقد صاحب کو سنا دیا جائے تو وہ پھڑک اٹھیں گے۔ مگر یہ شعر چونکہ سلام کا ہے اس لیے ان کی نگاہ میں اس کی کوئی قدر نہیں ہے۔

چھٹے شعر میں بھی شاعر نے یہی بتایا ہے کہ زندگی کے دن اب آخر ہونے کو آئے لہٰذا لازم ہے کہ ہم مآل پر نظر رکھیں۔ اور اپنی بات کو دلوں میں اتارنے کے لیے اس نے کہا ہے کہ ابھی وقت ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ صور پھونکے جانے تک درِتوبہ وا رہے گا۔ مگر توبہ اسی وقت ہوسکتی ہے جب تک نفس کی آمد و شد باقی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میر نفیسؔ نے اپنے اس شعر میں ''شباب'' کے لیے لفظ ''شب'' اور پیری کے لیے لفظِ ''صبح'' استعمال کیا ہے۔ جب کہ شعراء اس کے برعکس کہتے ہیں۔ اور ہم بھی جب بولتے ہیں تو شباب کو صبح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور بڑھاپے کو رات کہتے ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے کہ شباب سے پہلے ہے جس طرح صبح پہلے ہے، اور ضعیفی بعد میں ہے جیسے رات صبح کے بعد آتی ہے، لیکن میر نفیسؔ نے ایسا کیوں کہا؟ اس کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رہنا چاہئے کہ مآل کو انسان اجالے ہی میں دیکھتا ہے، اور اس کی بات آخر میں ہی ہوتی ہے۔

ساتویں شعر میں دنیا کو بہت عاریت (کرائے کا گھر ایسا گھر جس کو کسی نے کچھ دنوں رہنے کے لیے دے دیا ہو) بتایا ہے، اور یہ غلط بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم دنیا میں چند دنوں کے لیے آئے ہیں۔ ہمیشہ رہنا نہیں ہے۔ کاش اس بات کو ہم انسان وقت رہتے سمجھ لیں تو دنیا کے بہت سے بکھیڑوں سے نجات مل جائے۔ میر نفیسؔ نے اسے سرائے عاریت کہا ہے کہ جب کہ قرآن نے متاعِ غرور یعنی دھوکے کا گھر کہا ہے۔

اور آٹھویں شعر میں بھی انسان کی اسی حالت کا بیان ہے کہ جس سے ہم بھاگنا چاہتے ہیں۔ ہم جب یہاں سے چلے جاتے ہیں تو پھر لوٹ کر یہاں آنا محال ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے جوانی کا حصول پیری میں محال ہے۔ یہ سارے اشعار وہ ہیں جو ایک غزل کے دائرے میں آسکتے ہیں۔ اور ان پر بھی خوب خوب گفتگو ہوسکتی ہے، جیسے مندرجہ اشعار پر ہو رہی ہے۔ مثلاً

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
لحد میں کیوں نہ جائے منہ چھپائے — بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں
نفس پر ہے مدارِ زندگانی — نفس چلتی ہوئی تلوار بھی ہے

یا اسی طرح کے اور بھی بہت سے اشعار جنہیں آج غزل کی جان کہا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں میر نفیسؔ یا کسی اور سلام گو شاعر کے

اشعار لکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں بھی آپ کو ادب ملے گا۔ صنائع و بدائع کی خوبیاں ملیں گی، زبان و بیان کی چاشنی ملے گی، بس شرط یہ ہے کہ آپ ادب کو ادب کی نگاہ سے دیکھیں۔ دھرم، مذہب، ازم، مسلک یا فرقے کے معیار پر نہ پرکھیں۔ حالانکہ سلام کے ساتھ ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔

اب ذرا میر نفیسؔ کا ایک شعر اور پڑھیے۔ فرماتے ہیں۔

چھیڑ دوں گر ابھی افسانۂ حسنِ اکبرؑ
قصہ یوسفؑ و یعقوبؑ کہانی ہوجائے

تغزل، سے بھرپور اس شعر کو کیا ادب میں جگہ نہیں مل سکتی۔ کیا اسے صرف اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ یہ اس صنف سے تعلق رکھتا ہے، جسے ناقدین و مبصرین قدیم نے اپنی نگاہ لطف سے نہیں دیکھا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ قصہ یوسفؑ جب بیان ہوتا ہے تو اس میں زلیخا کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ تبھی وہ محبت کا مرکز بنتا ہے مگر یہاں تو یوسفؑ کے ساتھ زلیخا کا نام ہی نہیں ہے پھر اس میں تغزل کہاں سے آئے گا۔ تو میں کہوں گا کہ کیا ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی محبت ہی محبت ہے۔ کیا باپ سے بیٹے یا بیٹے سے باپ کی محبت، محبت نہیں، بیٹا ماں سے ماں بیٹے سے پیار کرے تو اسے پیار نہیں کہیں گے، بھائی بہن کے عشق کو عشق کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر یہ بھی محبت کے پہلو میں تو ان جذبات کو نظم کا لباس عطا کرنے والا بے توجہی کا شکار کیوں ہے۔ مذکورہ شعر میں ذرا نزاکت دیکھیے شاعر نے حسن جنابِ علی اکبرؑ کے سامنے قصہ محبت یوسفؑ و یعقوبؑ کو کہانی بتایا ہے اور وہ کہانی تھا بھی۔ کیوں کہ یوسفؑ لاکھ حسین سہی لیکن ہم شبیہ پیغمبرِ اسلام نہیں تھے۔ اسی لیے جب زلیخا یوسف پر فریفتہ ہوئی تو آپ نے اس سے کہا اگر تو حسن محمد عربی کو دیکھ لیتی تو تیرا کیا حال ہوتا، اتنا سنتے ہی اس کی جوانی پلٹ آئی۔ کیا آپ کو اب بھی حسن علی اکبرؑ کے سامنے حسنِ یوسفؑ کی کہانی نہیں نظر آ رہا ہے۔

یہاں آپ کہہ سکتے ہیں کہ دیکھیے۔ جنابِ یوسفؑ سے اس لیے محبت کرتے تھے کہ وہ نبیؑ تھے۔ تو میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ بے شک باپ اپنے اس بیٹے سے بہت محبت کرتا ہے جو کسی منصب کا حامل ہو۔ مگر یہ محبت اس وقت دوبالا ہوجاتی ہے جب بیٹے میں کمال کے ساتھ جمال بھی ہو۔

آیئے اب میر نفیسؔ کے یہ دو شعر پڑھتے ہیں

حیف ہر دم ہے کجی پر فلک شعلہ پرست	اب وقار شرفاء و نجبا کچھ بھی نہیں
اب نفیس آیا ہے ایسا ہی زمانہ اُلٹا	دوستی جس سے کریں دشمن جانی ہوجائے

پہلے شعر میں شاعر نے وقارِ شرفا گھٹ جانے کا شکوہ کیا ہے، اور یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ زمانے کی قدریں بدلیں تو ایک ایسا وقت بھی آیا جب کمتر بہتر بن گئے، اور جب رذیلوں کو حکومت ملی تو انہوں نے شریف و نجیب افراد کو ذلیل کرنا شروع کردیا۔ وہ شریف و نجیب لوگ کیسے تھے اس کی عکاسی یہ دو شعر کرتے ہیں۔ پہلا شعر نواب واجد علی شاہ اخترؔ کا ہے وہ کہتے ہیں۔

وہی ہم تھے کہ سر پر تاجِ گوہر پاؤں کے نیچے
وہی ہم ہیں کہ سر پر خاک پتھر پاؤں کے نیچے

اور دوسرا شعر راحتؔ اندوری کا ہے۔

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

میر نفیسؔ کے پہلے اور اخترؔ و راحتؔ کے شعر میں اپنی زبوں حالی اور نجیب سے رذیل بننے کا بیان ہے۔ مگر بات کہنے کا اپنا اپنا انداز ہے جو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ راحتؔ اندوری کا ان لوگوں سے کیا تعلق جن کے تاج عجائب گھروں کی آج زینت بنے ہوئے ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ واجد علی شاہ اخترؔ اور میر نفیسؔ نجیب، شریف اور شریف خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہاں یہ بھی درست ہے کہ شاعر کبھی کبھی جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کرتا ہے اور یہی کام راحتؔ اندوری نے کیا ہے۔ جب کہ اخترؔ اور نفیسؔ کے اشعار جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہیں۔

رہی بات نفیسؔ کے دوسرے شعر کی تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج ہی دوستی کا حال خراب نہیں ہے بلکہ کل بھی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس شعر کی ہمہ گیری لائقِ توجہ ہے کہ زمانہ گزرنے کے بعد بھی ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔

یہاں میں ایک شعر اور آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ اگر چہ اس مضمون کا غزل سے تعلق نہیں ہے مگر شعر میں ایک ایسی بات کا ذکر ہے جو غزل میں ایک خوبصورت تخیل مانی جاتی ہے۔ یعنی دوستوں کی بے وفائی، ان کی بے اعتنائی، انکا تجاہل، شعر یہ ہے، پڑھئے:-

دوستوں نے ہم سے کھینچا دستِ شفقت بعدِ مرگ
فاتحے کو ہاتھ بالائے لحد رکھتے نہیں

مجھے یقین ہے کہ یہ شعر پڑھتے ہی آپ کو ثاقبؔ لکھنوی کا شعر یاد آ گیا ہوگا۔

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

بے اعتنائیِ احباب کا یہ ایک عجیب اور عبرت ناک پہلو ہے، ثاقبؔ لکھنوی کے شعر میں بھی اگر چہ ایک حکم شریعت کا ذکر ہے مگر اس میں کوئی ایسا حکم نہیں ملتا۔ جیسا کہ نفیسؔ کے شعر میں ہے انہوں نے جہاں اپنے شعر میں ایک طرف انسان کی اس کمزوری کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو کتنی جلد فراموش کر دیتا ہے۔ وہیں دوسری جانب انہوں نے ایک دینی امر کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ کیونکہ کتبِ احادیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے ایک روایت نقل کی ہے کہ

جب کوئی بندہ قبر پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ خداوند عالم اس بندۂ مردہ کو بخش دے کہ یہ تیری بخشش کا محتاج ہے اور سورۂ فاتحہ و سورۂ قل ھواللہ (سورۂ توحید) پڑھتا ہے تو خدا اس کی قبر کو روشن اور کشادہ کر دیتا ہے اور اس دعا کرنے والے کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ (مستدرک الوسائل، میرزا نوری، جلد نمبر ۲ ص ۴۸۳ مکتبہ الشیعۃ جامع الاخبار محمد بن سبزواری ص ۱۶۹ مکتبۃ الحیدریہ)

اب ذرا سوچئے کہ شاعر کا سفر کتنا ہمہ گیر اور کتنے پہلو اپنے اندر سمیٹے ہے۔ وہ نا قدری احباب کا شکوہ بھی کر رہا ہے اور اپنے ہم مذہب بھائیوں کو درس بھی دے رہا ہے کہ تم ایک تعلیم اسلامی سے کنارہ کش ہوتے جا رہے ہو۔ کیا یہ ایک اچھے شعر کی پہچان نہیں ہے، اور کیا چھا جائی، بادۂ و شاعر، شباب و مستی، زلف و رخسار، ہجر و وصال، پتلی کمر اور لمبی زلف کے قصے یا پھر حالات زمانہ کا رونا، رونا، ماحول حرام ہونے کا شکوہ کرنا، ذات پات، اونچ نیچ کی باتیں، نیرنگیٔ زمانہ کا ذکر کرنا ہی معیاری شاعری کہی جاتی ہے۔

آخر میں حضرت میر نفیسؔ کے چند شعر اور لکھ رہا ہوں۔ ان میں مضمون آفریتی ہے۔ زبانی و بیان کا حسن ہے۔ تخیل کی پاکیزگی ہے۔

نزاکتِ الفاظ اور شاعرانہ پیرائے میں اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی ہے۔ یہی تو اچھی اور عمدہ شاعری ہے پڑھیے:

موت کو دور نہ سمجھے وہ بشر غافل ہے
قبر میں جانا ہے تکیہ میں کفن ساتھ رہے

نہ اسبابِ جہاں سے کچھ گیا ساتھ
یہی دو گز کفن ہے اور میں ہوں

جہاں میں حور و غلماں سے ہے صحبت
نئی اک انجمن ہے اور میں ہوں

مخفی ہے راہ راست جو رہبر نہیں ہوتا
کج ہوتی ہے وہ سطر جو مسطر نہیں ہوتا

جب تک نہ کرے سر قدم راہ خدا میں
یہ مرحلۂ عشق کبھی سر نہیں ہوتا

کوثر سے انہیں کیا جو ہیں مستوجبِ دوزخ
پیدا کبھی پانی میں سمندر نہیں ہوتا

خوش آئی نہ صحبت عمر و شمر کی حرؑ کو
باخبر ہے وہ جو طرفِ شر نہیں ہوتا

جب تک نہ ملے دولت خاگین قناعت
یہ دل ہے وہ مفلس کہ تونگر نہیں ہوتا

بادۂ علم بھی کیا بادہ ہے سبحان اللہ
صرف کرنے سے جو خالی نہ ہو جام ایسا ہو

بھول جائے دو جہاں کو دلِ شیدا میرا
صبح سے محوِ ثنا تا سرِ شام ایسا ہو

جو آخر میں ہیں وہ طولِ عمر سے ہاتھ اٹھاتے ہیں
کیا حق نے کفن کو جامۂ بے آستیں پیدا

مقتلِ شہؑ کی زمیں کہتی تھی دیکھ اے گردوں
حق نے ایک چاند دیا تجھ کو بہتر مجھ کو

ہر ایک چاہتا تھا پہلے کام آئیں ہم
یہ شوق مرگ تھا حضرت کے جاں نثاروں کو

کہا یہ پیاسوں نے یاں پی لیا اگر پانی
علی جو خلد میں دیں گے وہ آب کیا ہوگا

بڑا گھر قبر ہے کیسی عمارت دیکھ اے غافل
مکاں ہیں سیکڑوں ایسے نہیں جن کے مکیں پیدا

یہ کہیں سب نیک وہ نیت نہ کر
خاک ساری کر انانیت نہ کر

خوف غم میں رو کہ غم میں شاہؑ کے
اور غم میں شکر کر رقت نہ کر

جرمِ بے لذت اسی کا نام ہے
دوست کیا دشمن کی بھی غیبت نہ کر

بحر عالم میں نہیں خواہشِ گوہر مجھ کو
آبرو مجرئی دے خالقِ اکبر مجھ کو

گلِ زہراؑ کے ماتم میں دل محزوں پھڑکتا ہے
جگر میں مجرئی رہ رہ کے خارِ غم کھٹکتا ہے

یہ خوشبو رن میں پھیلی ہے علی اکبرؑ کے گیسو کی
زمین ساری ہے عنبر بیز سب جنگل مہکتا ہے

نفیسؔ اللہ پیری میں یہ غفلت
بس اب چونکو کہ دن کم رہ گیا ہے

مجھے یقین ہے کہ صاحبانِ نقد و نظر صنفِ سلام پر بھی توجہ دیں گے اور اسے بھی اس کا واجب حق دلانے میں کوششیں کریں گے۔

غیر مطبوعہ مرثیہ ''اسم''

محمد علی ظاہرؔ

اسم اک کیفیتِ رازِ تولائی ہے کور چشموں کے لیے باعثِ بینائی ہے
اسم آواز ہے اور حرف کی زیبائی ہے (۱) اسم میں اپنے مسمّٰی کی سی پہنائی ہے
محفلِ زیست کو عنوان یہی دیتا ہے
ہر کُل و جُزو کو پہچان یہی دیتا ہے

اسم ہر غیب کا عالم میں شہودِ کتبی اسم تہذیب کے ہونٹوں پہ درودِ کتبی
اِس نے بخشا ہے ہر اک شے کو وجودِ کتبی (۲) ورقِ دہر پہ اسما ہیں سجودِ کتبی
چارۂ کار نہیں اسم قبیلے کے سِوا
لبِ اظہار ہو گنگ اس کے وسیلے کے سِوا

فہم و ادراک کو عرفان یہی دیتا ہے عقل کو غیب کا فرمان یہی دیتا ہے
دِیں یہی، حق یہی، فرقان یہی دیتا ہے (۳) روحِ جبریلؑ کو قرآن یہی دیتا ہے
آیۂ ''آدم الاسماء'' کی جلالت کی قسم
اسم معیارِ الٰہی ہے رسالت کی قسم

اسم خود حمد ہے اور حامد و محمود بھی ہے آپ شاہد ہے شہادت بھی ہے مشہود بھی ہے
اسم ساجد بھی ہے سجادہ بھی مسجود بھی ہے (۴) خود عبادت بھی ہے عابد بھی ہے معبود بھی ہے
اسم نے آئنے ہستی کے عجب ڈھالے ہیں
خالق و خلق اسی نوشاہ کے شہ بالے ہیں

پردۂ کُنتُ سے کَنزًا میں نمودار ہے اسم ظرفِ مَخفِیّا میں گم ہست کا دربار ہے اسم
نورِ اَحبَبتُ سے ارواح کا اظہار ہے اسم (۵) چرخِ اُعرَف پہ لطائف کا چمن زار ہے اسم
فَخَلَقتُ اسم کو اندازۂ تجسیم ملا
الفِ غیبِ احد لام سے تا میم ملا

اسم کے باب میں ہے نکتۂ عرفانِ وجود — احدیت سے کیا حق نے جو وحدت میں ورود
(۶)
فیضِ اقدس سے وہ ہستی کے تعین کی نمود — اسم اللہ سے روشن ہُوا آئینۂ بود
جس نے ظاہر کیا خلقت کا طلسمِ اعظم
کون ہے عالمِ ہستی میں وہ اسمِ اعظم

اسم ہیئت مگر اشکال و صور سے بالا — اسم انوارِ خلائق کا سنہری ہالا
(۷)
اسم اس "لَيْسَ كَمِثْلِه" کی مثالِ اعلیٰ — جس نے کھولا ہے دَرِ ذات کا ہر اک تالا
اسم وہ غیب کہ "لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُو"
اسم اک نعرۂ مستاں "تنا نا ہو یا ہوٗ"

اسم ہستی کے مظاہر کا جمالِ اصلی — اسم تجسیم کے عالم کا ظہورِ فصلی
(۸)
اسم نے جب کہ کمر بہرِ تجلّی کَس لی — توڑ کے نکلا زمانے میں عدم کی پسلی
اسم معدوم کو موجود و عیاں کرتا ہے
اسم اگر 'کُن' ہو تو تخلیقِ جہاں کرتا ہے

باغِ اعیان میں سب ذوقِ نُمو ہے اس کا — دشتِ خارج میں جلالِ من و تُو ہے اس کا
(۹)
چشمۂ غیب سے سیراب گلُو ہے اس کا — عرَفا کہتے ہیں توحید سُبُو ہے اس کا
نقطۂ نفی بھی اثبات سے آ ملتا ہے
اسم کی منزلِ باطن پہ خدا ملتا ہے

اسم عنوان بھی عنوان کی تفصیل بھی ہے — حق کی تفضیل بھی ہے ، کفر کی تذلیل بھی ہے
(۱۰)
ابرہہ بھی تو ہے اک اسم ، ابابیل بھی ہے — اسم آدمؑ بھی ہے ، ہابیلؑ بھی ، قابیل بھی ہے
رہ گیا اسم کا امکان معما بن کر
آدمی جیتا ہے اب کس کا مسمّٰی بن کر

اسم آدمؑ ہے تو صفوت کا چلن رکھتا ہے — ہے براہیمؑ تو آتش میں چمن رکھتا ہے
(۱۱)
اسم موسیٰؑ ہے تو خالق سے سخن رکھتا ہے — اور ہے عیسیٰؑ تو مسیحائی کا فن رکھتا ہے
ہے محمدؐ تو سبھی خلق کا سرتاج ہے اسم
"قَابَ قَوْسَيْن" کی لو، صاحبِ معراج ہے اسم

اسم محمود تو پہنے ہے محمدؐ کی نقاب — اسم اعلیٰ ہے تو دائم ہے علیؑ سے رو تاب
(۱۲)
اسم فاطر ہے تو پھر فاطمہؑ ہے اس کا حجاب — اسم محسن تو حَسنؑ سے ہے سدا حسن مآب
ہے یہ احسان تو دل نورِ بصر پاتا ہے
سر بہ سر اسمِ حُسینؑ اس میں نظر آتا ہے

اسم کی یوں تو زمانے میں بہت ہیں اقسام قول ہے اہلِ گرامر کا مگر بہرِ عوام
معرفہ ؛ خاص کسی شخص ، جگہ ، چیز کا نام (۱۳) اسم نکرہ ہے بھلے عام مگر خاص ہے کام
خُم کا میدان ہے اک ظرفِ مکانی کی طرح
یاد ہے صبح غدیر اسمِ زمانی کی طرح

اسم جامد ہو تو بے فیض ہے کنکر کی طرح اسم مصدر ہو تو خلاق ہے محور کی طرح
اسم اشارہ ہے ادھر اور کبھی اودھر کی طرح (۱۴) اسم موصول تو ہے طائرِ بے پر کی طرح
اور اگر اسم علم ہے تو علم دار بھی ہے
باوفا ، بوالقربہ ، وافی و طیار بھی ہے

اسمِ تکبیر ہے اکبرؑ کی جوانی کی طرح اسم تصغیر ہے اصغرؑ کی کہانی کی طرح
اسمِ جمع اشقیا کے لشکرِ فانی کی طرح (۱۵) اسم آلہ کسی خنجر کی روانی کی طرح
اسم موصوف کوئی سہمی ہوئی بچی ہے
اسمِ مشتق کسی لاشے کی کٹی انگلی ہے

اسم مظلوم ہے جلتے ہوئے اک در کی طرح اسم مضروب ہے سجدے میں جھکے سر کی طرح
اسم مسموم ہے اک لولوئے خوشتر کی طرح (۱۶) اسم مجروح ہے تیروں بھرے پیکر کی طرح
ظلم جب حد سے سوا ہو تو نذیرہ بن کر
اسم دربار میں آتا ہے اسیرہ بن کر

اسم کا شور ہے طوفانِ تلاطم کی طرح اسم کا ساز ہے جھرنے کے ترنُّم کی طرح
اسم کی دھوپ ہے صحرائے تکلّم کی طرح (۱۷) اسم فطرت میں ہے بچے کے تبسّم کی طرح
اسم شاہوں کو سرِ قصر ڈپٹ سکتا ہے
پا بہ زنجیر بھی ہر تخت الٹ سکتا ہے

اسم کے نور میں ڈھل ڈھل کے نکھرتی ہے دھنک اسم کی دھار پہ ڈھل ڈھل کے جھپکتی ہے پلک
اسم کی موج میں رہ رہ کے پنپتی ہے سمک (۱۸) اسم کی شاخ پہ آ آ کے بکھرتی ہے مہک
اسم گیتی کا چمکتا ہُوا آویزہ ہے
صبح پارہ ہے ، سجل تارہ ہے ، شب ریزہ ہے

اسم کے آئنہ خانے ہیں جہاں میں ہر سو یہ تگاپو ، یہ دنادن ، یہ گھما گھم ، ہا ہو
یہ بچھیرے ، یہ مہوکھے ، یہ بھجنگ اور یہ پکھیرو (۱۹) موتیا ، چمپا ، چنبلی ، گلِ نرگس ، شبو
ہو نہ گر اسم تو بے سود یہ جم ، جاپ تمام
یہ چھنن چھن ، تتا ری ری ، یہ گمک ، تھاپ تمام

اسم انداز بھی آدرش بھی آہنگ بھی ہے   اسم تعمیر بھی اور آرٹ بھی ارٹنگ بھی ہے
اسم تہذیب بھی، کلچر کا حسیں رنگ بھی ہے (۲۰) اسم جُٹی بھی ہے ، چوٹی بھی ہے اور ونگ بھی ہے
اسم دریائی زمیں ہے کسی بیلے کی طرح
اسم کے رُوپ ہیں سو جھنگ کے میلے کی طرح

اسم کے باب میں اس رمز کا مفہوم بھی ہے   اسم خادم ہے تو یعنی کوئی مخدوم بھی ہے
اسم عالم ہے تو مطلب کوئی معلوم بھی ہے (۲۱) ہے اگر اسم تو گویا کوئی موسوم بھی ہے
اسم رستہ ہے جو منزل کا پتا دیتا ہے
اسم پانی ہے مگر آگ لگا دیتا ہے

اسم اک سیل ہے موجوں کی روانی کی طرح   اسم وزنی ہے دو عالم کی گرانی کی طرح
اسم ہے اپنے مسمّٰی کی کہانی کی طرح (۲۲) اسم مخلوق ہے خالق کی نشانی کی طرح
اسم کُرسی ہے جو کونین پہ چھائی ہوئی ہے
اسم ہے عرش جہاں غیب نمائی ہوئی ہے

اسم کے آئینے میں جلوۂ موسوم ہے یُوں   کاف اور نون میں پوشیدہ ہے جوں کن فیکوں
فلسفی خوار ہے اس دشت میں عاشق ہے زبوں (۲۳) اسم کے سامنے بے بس ہیں خرد اور جُنُوں
ہر کہ و مہ پہ یہ اَسرار کہاں کھلتا ہے
اور جو کھلتا ہے تو اک طرفہ جہاں کھلتا ہے

اسم کا جلوۂ صد رنگ تھا کس نے دیکھا   غیب نے آپ ہی کی اپنی تجلی افشا
ہیں جو نناوے اس ذات کے اسما حسنیٰ (۲۴) منعکس ان میں ہے اللہ کا نورِ اعلیٰ
ان کے پردوں میں خلائق کو ابھارا حق نے
انھی آئینوں میں اپنے کو سنوارا حق نے

قادر و قائم و قیوم و قوی و غفار   باعث و باری و قدوس و عزیز و جبار
مَلِک و مومن و مبدیع و محیط و قہار (۲۵) مانع و منتقم و ضار و عفو و ستار
آئنہ خانوں کی اک کاہکشاں روشن ہے
انھی اسما کی تجلی سے جہاں روشن ہے

ہاں مگر فیض ان اسما کو بھی درکار تو ہے   سامنے ان کے بھی اک غیب کا دربار تو ہے
جلوۂ ذات کا آخر کوئی معیار تو ہے (۲۶) ان کی خاطر بھی کوئی مرکزِ انوار تو ہے
کچھ جلالی ہیں تو کچھ ان میں جمالی اسما
اسمِ اعظم نہ اگر ہو تو ہیں خالی اسما

کون سے اسم کے سورج کی درخشانی ہے — کن شعاعوں سے ان آئینوں میں تابانی ہے
صورتِ غیبِ احد جس نے کہ پہچانی ہے (۲۷) اے زہے اوج! وہی اسم تو لافانی ہے
اسم وہ اسم کہ اسما کا جسے شاہ کہیں
جب وہ اک لفظ میں ڈھل جائے تو اللہ کہیں

یوں تو ہر اسمِ الٰہی ہے بقا کی صورت — سم اعیان میں ہیں علمِ خدا کی صورت
''نحن اسما'' سے کھلی دل پہ ولا کی صورت (۲۸) ایسی صورت ہے تو کہہ دوں عرفا کی صورت
عینِ ثابت میں اسے جلوۂ وحدت جانو
اسم ''اللہ'' محمدؐ کی حقیقت جانو

ہاں یہی اسم ہے انسان کی صورت میں عیاں — ہے اسی اسم کے ہالے میں زماں اور مکاں
وہ ملائک ہوں کہ ارواح کہ اجسامِ جہاں (۲۹) ہیں اسی چشمۂ خورشید سے انوار بہ جاں
کثرتِ ہست میں وحدت کا شرَف دیکھتا ہے
اس کے آئینے میں حق اپنی طرف دیکھتا ہے

اسم ''الاّ'' کے دلِ ناز میں ہے لا کی قسم — اسم قرآن کے آغاز میں ہے با کی قسم
اسم اک ''سین'' کے اعجاز میں ہے یا کی قسم (۳۰) اسم در صورتِ ہُو راز میں ہے ہا کی قسم
اسم تا اسم مراتب کا سفر ہوتا ہے
جس طرح تخم میں مکنون شجر ہوتا ہے

اسم مجموعۂ اصوات ہے لفظوں کی طرح — اسم گہوارۂ یک ساز ہے پردوں کی طرح
اسم وجدان کا احساس ہے جلووں کی طرح (۳۱) اسم ہستی کی تگ و تاز ہے سانسوں کی طرح
اتنا ارزاں نہیں ہر ایک پہ در باز کرے
اسم کی مرضی جسے مائلِ پرواز کرے

اسم درویش ہے سلمانؓ و ابوزرؓ کی طرح — اسم بے خوف ہے میثمؓ سے قلندر کی طرح
اسم ساونت جری مالکِ اشترؓ کی طرح (۳۲) اسم دیوانگی بہلولؒ سے دلبر کی طرح
اسم طالب ہو تو پھر علم کی میزان بنے
درسِ صادقؑ سے اُٹھے جابرِ حیانؒ بنے

اسم تحریر ہے اوراد کے صحراؤں میں — اسم کی گونج ہے مندر میں کلیساؤں میں
اسم مسجد میں مزاروں کی ہری چھاؤں میں (۳۳) اسم وجدان میں سالک کی تمناؤں میں
یوں وظائف کے الٹ پھیر میں کب ملتا ہے
اسم تب ملتا ہے جب صاحبِ رب ملتا ہے

اسم اک خط ہے خدا اور خلائق کے میاں ک طرف جس کے ہے حق ایک طرف ہے انساں
نقطے نقطے میں عوالم ہیں کراں تا بہ کراں (۳۴) اور سرے گھوم کے اک دوجے کی جانب ہیں رواں
دائرہ اسم کا یوں فیض بہم کرتا ہے
یہ ''الیٰ الحق'' کو ''الیٰ الخلق'' میں ضم کرتا ہے

اسم میں ہوتی ہے شخصیتِ موصوف نہاں اسم بچے کا ، بھرے گھر کی امیدوں کا نشاں
اسم رکھنے میں ہے ماں باپ کی حسرت پنہاں (۳۵) ہو بزرگوں کی طرح طفل بھی نامیٔ جہاں
یہ رواج آج بھی نسلوں میں چلا آتا ہے
نام فرزند کا دادا پہ رکھا جاتا ہے

اسم تو ایک علامت ہے اشارے کی طرح اک کنارے کی طرف دوجے کنارے کی طرح
دشتِ بے سو میں مسافر کو ستارے کی طرح (۳۶) چشمِ بے آس کو منزل کے نظارے کی طرح
ثبت ہر راہ پہ ہے آبلہ پائی اس کی
ہے جبینوں کا حرم قبلہ نمائی اس کی

کنہِ لاحد کو جو اک حد میں پروئے وہ اسم جو تجرد کو تجسم سے بلوئے وہ اسم
ظرفِ مجہول میں معلوم جو ہوئے وہ اسم (۳۷) وسعتِ ذات جو اپنے میں سموئے وہ اسم
فکرِ بے ربط کو ترکیبِ بیاں دیتا ہے
بے نشاں کو بھی یہ اک نام و نشاں دیتا ہے

اسم پہچان ہے اشیا کی تعقل کے لیے بات سمجھانے کو ، ادراک و تامل کے لیے
ربطِ باہم میں یہ لازم ہے تسلسل کے لیے (۳۸) ایک عرفاں کی طرح ایک تجاہل کے لیے
ہو نہ گر اسم تو بس سایۂ ابہام رہے
آدمی اپنے ہی اظہار میں ناکام رہے

اسم جب حرف کے پندار میں آ جاتا ہے آدمی قوتِ اظہار و بیاں پاتا ہے
باغِ جذبات کی ہر شاخ کو مہکاتا ہے (۳۹) جھومتا ہے کبھی ہنستا ہے کبھی گاتا ہے
اسم ہر فعل کو اک لفظ عطا کرتا ہے
اسم انساں کو تمدن کا خدا کرتا ہے

اسم کے باب میں ہے ذات و صفت کا بھی بیاں ذات اک جوہرِ موجود کہ از خود تاباں
اور صفت ذات میں موجود کسی وصف کی شاں (۴۰) درمیاں ذات و صفت کے ہے یمِ اسم رواں
کبھی اک فرقِ خفی صرفِ لغت ہوتا ہے
اور کبھی اسم ہی خود عین صفت ہوتا ہے

اسم مفہوم کی صورت پہ ہی موقوف نہیں   اسم کے واسطے ہے ایک حقیقت بھی کہیں
کیا ''شجر'' وہ ہے جو ادراک میں ہے پردہ نشیں (۴۱) یا وہ چھتنار جو دھرتی پہ ہے چھاؤں کا امیں
اسم ہے ذہن میں مفہوم بتانے کے لیے
یا کہ موسوم سے خارج میں ملانے کے لیے

کبھی اک لفظ سے معنیٰ کی طرف آتا ہے   اور کبھی کوئی وجود اسم میں ڈھل جاتا ہے
جس طرح اسمِ ''علیؑ''، رب کی طرف لاتا ہے (۴۲) ذاتِ حیدرؑ سے بھی دل حق کا نشاں پاتا ہے
ہیں جو ننانوے لفظی ہیں وہ حسنیٰ اسما
بالوجود اس کے ہیں عالم میں یہ چودہ اسما

مسندِ ذات پہ ہے غیبتِ غیبی کا حُضور   کھلے اس باب میں گر لب تو تمھارا ہے قُصور
اسم ''اللہ'' سے ہے نورِ الٰہی کا ظُہور (۴۳) اسم لفظی کا مگر اسمِ وُجودی ہے ضُرور
''علی اللہ ازل گفت'' کا نکتہ سمجھو
ذاتِ خالق کا نہیں اسم کا جلوہ سمجھو

اسم کیا؟ ذات کی جانب ہے دلالت کا نشاں (۴۴) شیخِ اکبر کا ہے اس باب میں معروف بیاں
کُل خلائق سے دلالت سوئے باری ہے عیاں   پس ہر اک نفس ہے اک اسمِ خدائے دوجہاں
کوئی ناقص ہے اشارت میں کوئی کامل ہے
جس کی اکمل ہے دلیل اسم وہی کامل ہے

ہے اگر یوں تو پھر اس پر ہے تطابق یہ بجا (۴۵) جہاں شدت سے دلالت ہو وہ اسمِ اعلیٰ
کم نما نورِ مسمیٰ ہو تو اسم ادنیٰ   اب ذرا دیکھیے عالم میں تصادم ان کا
نور کامل تھا مسمّیٰ کا تو ہابیلؑ بنا
آئنہ اسم کا ناقص تھا سو قابیل بنا ابن العرَبی

اسمِ طالوتؑ میں تھا نور صباحی چھب کا   اسمِ جالوت میں شامل تھا اندھیرا شب کا
اسمِ موسیٰؑ میں ہویدا ہوا جلوہ رب کا (۴۶) اسمِ فرعون میں ابلیس کا شعلہ بھبکا
اسم عمرانؑ میں قرآن کی ضو کاری تھی
اسم سفیان میں ایمان سے غداری تھی

اک طرف اسم میں کامل تھا تجلی کا ظُہُور   اک طرف ظلمتِ شر نے اسے رکھا بے نور
اسی ظرفیتِ اسمی کا بڑھا جبکہ وُفور (۴۷) آ کے میدانِ بلا میں ہوئے اسما محشور
کھل گئی رمزِ نہاں اسم کے کیف و کم کی
حسبِ مقدور مسمیٰ کی تجلی چمکی

اسم اوڑھے ہوئے تطہیر کا آیہ بن میں سورتیں ساتھ لیے شان سے آیا بن میں
اسم نے اپنے قبیلے کو لٹایا بن میں (۴۸) چھے مہینے کا بھی معصوم سلایا بن میں
خون کے داغ جمے سینے کے تعویذوں پر
اور ہَوا ریت گراتی رہی مشکیزوں پر

اسم کے لشکرِ احمر کا جلال اور جمال گلِ حماسۂ توحید ہر اک لب کا مقال
تشنگی میں وہ سُکوں بھوک میں وہ استقلال (۴۹) ہر رگِ کشتہ سے کھلتا ہوا اک بابِ کمال
خون کی لو سے تجلّی میں سماتے اسما
اسمِ اعظم کے لیے خود کو مٹاتے اسما

اسم چنتا رہا تا عصر حُرُوفِ قرآں کبھی پاروں کے ورق اور کبھی جلدوں کے نشاں
چند سورے تھے ادھر ریگ کی چادر میں تپاں (۵۰) اک رُکوع اس کا پریدہ تھا سرِ آبِ رواں
کہیں خوں رنگ ضیا آنکھ سے چھن پڑتی تھی
کہیں حلقوم میں نیزے کی کرن گڑتی تھی

اسم میدان میں پہنے ہوئے اب سرخ قبا ریگ اور خون کے سیلاب میں تنہا ہے کھڑا
تشنہ ہونٹوں پہ لرزتی کوئی صد برگ دعا (۵۱) زخمی پیکر سے لپٹتی ہوئی صحرا کی ہوا
خون زخموں کا ہتھیلی کے پیالے میں لیے
جس طرح عالمِ ہستی ہے دوشالے میں لیے

شجرِ جسم پہ برچھی کا ثمر لگتا ہوا کھول کر ہاتھ سوئے چرخِ بریں تکتا ہوا
دشت میں مثلِ حُرُوف اسمِ خدا کٹتا ہوا (۵۲) اور ادھر مہر کنارے پہ کہیں ڈھلتا ہوا
تشنہ ہونٹوں سے شہادت کی اذاں دیتا ہے
بڑھ کے ہر تیر کو سینے میں اماں دیتا ہے

اسم پھیلائے ہوئے ہاتھ خدا کی جانب جُھوم کے آتا ہے ہر تیرِ قضا کی جانب
ہے کشش اس کو عجب تیغِ جفا کی جانب (۵۳) ہے رضا اس کی طرف اور وہ رضا کی جانب
زخم کھاتا ہے تو اُمّت کو دعا دیتا ہے
سجدۂ شکر میں سر اپنا جھکا دیتا ہے

اسم ''اللہ'' کی پہنے ہوئے سینے پہ زرہ جسمِ صد چاک میں کھلتی ہوئی سوفاروں کی رہ
زخمی پیکر سے کشا ہوتی سنانوں کی گرہ (۵۴) بس کوئی دم میں سمٹتی ہے یہ ہستی کی برہ
نیزہ و گرز و تبر بڑھ کے بدن چومتے ہیں
مانگے گر آب تو پیکان دہن چومتے ہیں

خوں کے بہتے ہوئے قطرے ہیں اسے آبِ وضو رخِ نوروز پہ ہے نور کا جلوہ یک سو
لو رکھا اسم نے شمشیرِ ستم گر پہ گلو گود میں بھرنے کو وا ہو گئے ماں کے بازو (۵۵)
رنگ یہ دیکھ کے بیٹی کا جگر پھٹتا ہے
ماں کے آغوش میں مظلوم کا سر کٹتا ہے

رو کے کہتی ہے سکینہؑ یہ بصد کرب و جلال ہاتھ اے شمر مرے باپ کی زلفوں سے نکال
تو سمجھتا ہے کہ بے آس ہوئی شاہ کی آل ابھی حضرت کی حفاظت کو یہ دکھیا ہے بحال (۵۶)
دیکھ کے پشت تہی جور و ستم کرتا ہے
سانس لے لے کے سرِ شاہ قلم کرتا ہے

بے ادب! پاؤں مرے بابا کے سینے سے ہٹا کیا خبر تجھ کو کہ یہ تھی مرے سر رکھنے کی جا
پیار سے گود میں بھرتے تھے جو شاہِ دوسرا ان کے سینے کو بنا لیتی تھی تکیہ اپنا (۵۷)
رکھ کے رخسار کو سینے پہ سکوں پاتی تھی
دھڑکنیں شاہ کی سنتے ہوئے سو جاتی تھی

❀❀❀❀

صغیرؔ سونوی کے مرثیے
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

انیسِ مرثیہ
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

دبیرِ مرثیہ
زیرِ طبع
اصغر مہدی اشعر

انوارِ کساء کی مضطرشعائیں

پروفیسر ناشرؔ نقوی

شیرازِ ہند، جونپور کی تاریخی، علمی، تہذیبی، روحانی اور ایمانی سرزمین سے وابستہ عالم باعمل اور شاعرِ بے بدل سیّد عباس حیدر زیدی ''مضطرؔ جونپوری'' کے تیسرے کلام مودّت کا مجموعہ بعنوان ''انوارِ کساء'' حصّہ دوم اس وقت میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۵۹۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں سرکارِ دوعالمؐ سے اہل کساء واہلِ حرم کی مدح وثنا میں ۱۰۸ منظومات شامل ہیں۔ ان جملہ منظومات کی انفرادیت یہ ہے کہ قارئین کو شاعری کی ہر صنف کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بظاہر یہ کلامِ معرفت ومودت ہے لیکن مضطرؔ جونپوری نے اپنے بیانیہ کو حقیقت و صداقت نگاری سے جسم وروح کی طرح مربوط ومضبوط رکھا ہے۔ مجموعی طور پر زیرِنظر ''انوار کساء'' کی شاعری پروانۂ نجات وحیات ہے۔ مجموعے کی پہلی ہی نعت کا پہلا مطلع مضطرؔ جونپوری کے نظریۂ اشاعت کی توثیق ہے

نعتِ نبیؐ کا ربط مری زندگی سے ہے
بخشش کا آسرا تو اسی شاعری سے ہے

شاعری بخشش کا آسرا اور وسیلہ تب بنتی ہے جب انسانی زندگی سچائی اور عظمت کی ڈگر پر چلنے کی تحریک دیتی ہے۔ شاعری سے ایک ایسی رہ گزر بنانا کہ جس کے دورویا تقدس واحترام کے روشن فانوس روشن ہوں۔ ''انوار کساء'' کے نور کو نئے مفہوم وشعور کے ساتھ تڑپتے ہوئے عوامی ادراک سے مضطر بن کر جس طرح مضطرؔ جونپوری نے وابستہ کیا ہے وہ ان کا مذہبی ہی نہیں علمی کارنامہ بھی ہے۔ اس ضمن میں ایسے اشعار خود شعور کے نور کی مثال ہیں۔

خدا نے جس کے پیکر کو جدا رکھا ہے سائے سے — ہے اس کے سر پہ بھی قائم ترا سایہ زمانے میں
پھر تو اللہ بھی کرتا ہے دعاؤں کو قبول — نامِ زہراؑ جو دعاؤں کو وسیلہ ہوجائے
کسی کا تصور اسے پائے کیوں کر — جو لاہوت کے دشت میں اڑ رہا ہے
آب و ہوائے نور کا تھا یہ اثر شعار میں — فردِ فرید پنجتنؑ ہوگیا اعتبار میں
سبطینؑ وعلیؑ نے آتے ہی گھر میں پوچھا شہزادی سے — ہر سمت سے دونوں عالم کے سلطان کی خوشبو آتی ہے

پورے مجموعے میں مضطرؔ جونپوری نے اس التزام اور انتظام پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے کہ مجموعے کا نام ''انوار کساء'' ہے، اس مرکز سے ہٹ کر کوئی بات نہ ہو۔ یہ سلیقہ اور احتیاط ان کے منصبی نظام کی دین ہے۔ ایک مدرس اور ایک پرنسپل اداروں اور نسلوں کے ربط وضبط کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ منصبی نظام تدبیروں سے تحریروں میں ڈھلتا ہے اور تنویروں کی مثالیں قائم کردیتا ہے۔ مضطرؔ جونپوری کی پوری زندگی اور شاعری اس نہج کی ترجمان ہے۔

انوارِ کساء کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں موصوف نے اہلِ کساء کے انوار کی تجلّی کو ہر امامؑ کی مدح وثنا میں پرکھا اور پیش کیا ہے۔ شعراء اہلبیتؑ کے عام طور پر جو مجموعہ ہائے کلام منظرِ عام پر آتے ہیں ان میں مودودِ چند ہی ہیں جن میں بارہ اماموں سے متعلق سلسلہ وار مناقب ہوں دوسری افادیت یہ ہے کہ مضطرؔ جونپوری نے کتاب میں شامل کلام کو مخمس، میں بھی نمایاں طور پر اجاگر کیا ہے۔ تیسری افادیت یہ کلام زیادہ تر مطروحہ ہے۔ شاعر کے اس طرز ارادت میں ممدوح کی مدحت کے دائرے میں مزید توسیع ہوئی ہے۔ مثلاً مولا علیؑ کی شان میں دی گئی طرح 'جبیں کو تلاشِ درِ مرتضیٰؑ ہے' میں مضطرؔ جونپوری کا یہ بند علیؑ کی شان عبادت کا بہترین تعارف ہے۔

کلامِ خدا بر زبانِ سخنور عبادت کی جان زیبِ محراب و منبر
وہ سجدوں میں محویت اللہ اکبر خبر جس کو اپنی نہیں سر جھکا کر
کہ تیرِ ستم کوئی پیوستِ پا ہے

شاعر کی اشاریت، رمزیت اور تلمیح قاری اور سامع کو جائے نماز تک پہنچا دیتی ہے جو ممدوح کے اصل پیغام کی حرمت ہے۔ مضطرؔ جونپوری کے کلام میں جو تلمیحی نظام ہے وہ ان کو دوسرے شعراء سے ممتاز بناتا ہے۔ ایک ایسی ہی منقبت امام زین العابدینؑ کی شان میں ہے جو ارشاریت کی غماز ہے۔ اس مخمس کا یہ بند بازارِ شام کی تصویر اُجاگر کر دیتا ہے۔

منبرِ شام سے خورشید ہوا نور فشاں جس کے خطبے سے ہوئی بند حکومت کی زباں
بن گئی حق کی نظر خود ہی موذن کی زباں اہلِ دربار کی آنکھوں سے ہوئے اشک رواں
لب سے مظلوم کے جب درد کا دریا نکلا

میں نے رفتہ رفتہ جستہ جستہ ''انوارِ کساء'' کا مطالعہ کیا ہے، مضطرؔ جونپوری کا تقاضہ رہا کہ میں اپنے ابتدائی تاثر کو قلم بند کروں۔ بہر حال تعمیلِ حکم مجھ پر اس لیے واجب تھی کہ کسی مضطر کی بے چینی کا حساس انسان کو ویسے بھی برداشت نہیں ہوتی جب کہ میرے لیے مضطرؔ صاحب بزرگ بھی ہیں اور ایک نیک عہد ساز شاعر بھی ہیں مضطرؔ جونپوری کے مرثیے ہمارے عہد کا سرمایۂ ادب ہیں۔ موصوف کے مرثیوں میں مردہ تہذیب و تاریخ کو جھنجوڑنے کی بھرپور طاقت ہے جہادِ کربلا کے عنوان سے مضطرؔ جونپوری کے مرثیے روایت اور جدت کے امتزاج کے ساتھ ضمیروں پر دستک دیتے نظر آتے ہیں۔ موجودہ عہد کا مرثیہ ضمیروں کی رزم گاہوں کو مہمیز کرنے کے لئے آلۂ شعور ہے۔ موجودہ انسانی رشتوں کی عظمت کو کربلائی رشتوں سے آراستہ کرنے کے لیے اب سیف سے زیادہ قلم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ہمارا عہد جنگ و جدل کا نہیں فکر و عمل کا دور ہے۔ ان ہی نکات اور صفات کو پیشِ نظر رکھ کر مضطرؔ جونپوری نے ''جہادِ کربلا'' کے مرثیوں میں اپنی انفرادیت بنائی ہے۔

اے کربلا فروغ دہِ امتحان ہے تو خاکِ زمیں پہ گلشن جنّت کا نشان ہے تو
تاجِ سر کمالِ بشر بے گماں ہے تو بالا جو آسمان سے ہے وہ آسماں ہے تو
اکسیر تیری گرد رہِ کارواں بنی تیرے قدم کو چھوکے زمیں آسماں بنی
طالع ہوا ہے تیرے افق سے وہ آفتاب روشن ہے جس کے نور سے پیشانیٔ کتاب
یہ وہ ہے جس نے کردیا انجام بے نقاب دیکھے بغیر آکے اسے چشمِ انقلاب
روشن ہے ذاتِ پاک شۂ تشنہ کام کی بھٹی کے نیچے قبر ہے نمرودِ شام کی

انیسؔ دبیرؔ کی مرثیہ نگاری ہم موجودہ مرثیہ نگاروں کے لیے ایک رہنما اصول ہے لیکن یہ اصول ہمیں فی زمانہ عصر حیات اور لفظیات کے ساتھ آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مضطرؔ جونپوری کی اشاریت اور رمزیت نئے مرثیوں کے نئے امکانات کا وسیع کینوس تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھی ہے یہ ہی انفرادیت مضطرؔ جونپوری کی شناخت بھی ہے۔ اب عمر کی جس منزل میں آکر مضطرؔ جونپوری باعمل زندگی کو شاعری کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں اس کی پذیرائی ہمارا فرض ہے بقول مشتاقؔ لکھنوی مرحوم

معانی کی چمک سے یوں سجایا ہے کلام اپنا عمارت مسکرا اٹھی ہے جیسے سنگِ مرمر کی
ادب کی راہ میں بھی منفرد اک راستہ رکھا کروں تعریف کیا مشتاقؔ میں اندازِ مضطرؔ کی

المختصر یہ کہ مضطرؔ جونپوری ہمارے عہد کے صاحبِ طرز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مثالی باعمل، وضعدار اور مہذب انسان ہیں جن کے کارنامۂ ادب کو آنے والا وقت فراموش نہیں کر سکتا۔ میں مضطرؔ جونپوری کے ''انوارِ کساء'' حصہ دوم کو ممدوحین کی جزا سے تعبیر کرتا ہوں۔

ساحرؔ لکھنوی کے چند قلمی آثار

سیّد ضمیر حیدر

گذشتہ مضمون کی طرح اس مضمون میں ساحرلکھنوی، کی ابتدائی شاعری کے علاوہ درج ذیل اصناف سے متعارف کرواتا ہوں۔

نظمیں:۔

(۱):۔ اے حرم (۱۴۱۱ھ میں حج کے بعد مکہ مکرمہ سے رخصت ہوتے ہوئے خطاب)

(۲):۔ سوزخوانی

(۳):۔ موقلم (صادقین امروہوی)

(۴):۔ التجائے شرکت (اپنی والدہ کے چہلم کی مجلس کا منظوم رقعہ)

(۵):۔ تین مختصر قصائد

(۶):۔ ملی نغمہ

(۷):۔ ایک صدارتی تقریر

ساحرلکھنوی نے اپنی بڑی بہن اور بہنوئی سیّد کلب ہادی صاحب کے ساتھ ۱۹۵۵ چوبیس (۲۴) برس کی عمر میں پاکستان ہجرت کی؛
ساحرلکھنوی نے اپنی شاعری کی ابتدا جس سلام سے کی اس کا مطلع اور چند شعر ملاحظہ فرمائیں

نہ اکبرؑ تمھاری جوانی رہے گی ۔۔۔ مگر تا قیامت کہانی رہے گی
علم کا یہ سایہ بتاتا ہے غازی ۔۔۔ ہراک موج دریا کی دھانی رہے گی
ذرا دیکھ جمشید رنگِ مصورؔ
یہ فاخرؔ کی باقی نشانی رہے گی

اس مقطع میں ''مصور'' ساحر صاحب کے والد کا تخلص ہے اور ''فاخرؔ'' ساحر صاحب کے پردادا نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب کا تخلص ہے
''جمشید'' ساحرلکھنوؔ صاحب کا ابتدائی تخلص،

دوسرا سلام جو انھوں نے بغرضِ اصلاحِ مولانا سید اولاد حسین شاعرؔ معروف مولوی للّن صاحب کی خدمت میں پیش کیا وہ درج ذیل ہے

فوج میں انقلاب آتا ہے ۔۔۔ ابنِ ابوترابؑ آتا ہے
روئے اکبر پہ چھا چلے گیسو ۔۔۔ ابر میں آفتاب آتا ہے
اک پئے قتلِ سبطِ پیغمبرؐ
لشکرِ بے حساب آتا ہے

کھلبلی کیوں مچی ہے فوجوں میں کیا بنِ بوترابؑ آتا ہے
دل صغراؑ کو ہے یہ ہی الجھن دیکھیے کیا جواب آتا ہے
کون میرے گنہ گنے جمشیدؔ
کس کو اتنا حساب آتا ہے

اس سلام کے بعد ساحرؔ صاحب نے اپنا کلام حضرت فضلؔ لکھنوی مرحوم کو دکھایا؛ ایک نوحے کے چند اشعار

تقدیر نے کیا کیا دکھلایا شبیرؑ نے کیا کیا دیکھا ہے بے شیر کی میت دیکھی ہے، عباسؑ کا لاشہ دیکھا ہے
بانوؑ نے لہو میں ڈوبا ہوا بے شیر کا کرتا دیکھا ہے اجڑی ہوئی گودی دیکھی تھے ٹھہرا ہوا جھولا دیکھا ہے
خیمے کی طرف اکثر رن سے مڑ مڑ کے نگاہ کی اکبرؑ نے لیلیٰؑ نے دھڑکتے دل کی طرح ہلتا ہوا جھولا دیکھا ہے
جمشید کوئی یہ بتلادے کیا صبر کرے وہ ماں جس نے برچھی کی انی سے لپٹا ہوا بیٹے کا کلیجہ دیکھا ہے

مخمس کے چند بند ملاحظہ فرمائیں

مثال شمس و قمر جگمگا رہے ہیں حسینؑ جہاں پہ ابرِ کرم بن کے چھا رہے ہیں حسینؑ
نگاہِ کون و مکاں میں سما رہے ہیں حسینؑ دلوں پہ سکۂ الفت جمارھے ہیں حسینؑ
سبق وفا کا جہاں کو پڑھا رہے ہیں حسینؑ

دہم کو کرب و بلا میں وہ حشر کا منظر لہو شہیدوں کا بہتا تھے جلتی رہتی پر
نہیں ہے اب کوئی ہمدم نہ مونس و یاور شہید ہو گئے انصارِ سبطِ پیغمبرؐ
سحر سے لاشوں پہ لاشے اٹھا رہے ہیں حسین

گیا ہے رن میں رضا لے کے اب جواں بیٹا گھرا ہے نرغۂ اعدا میں بیکس و تنہا
شہید ہوگیا سینے پہ جب پڑا نیزہ اٹھا کے دشت سے کڑیل جوان کا لاشا
کمالِ قوتِ دل آزما رہے ہیں حسینؑ

شہید ہوگئے، کاٹا لعیں نے خشک گلا سیاہ آندھیاں آئیں، ہوا سے خوں برسا
زمانہ ہوگیا جمشیدؔ گرچہ صدیوں کا مٹانا چاہتے ہیں اب بھی نامِ شہؑ اعدا
مگر فضائے دو عالم پہ چھا رہے ہیں حسینؑ

ایک مسدس کے دو تین بند

دہم ماہِ محرم کو وہ دیکھا ہے سماں توڑ دیتا ہے دل اہلِ عزا جس کا بیاں
جس کے نظارے سے معذور ہوئے کون ومکاں آج تک چشمِ زمانہ میں ہے خیموں کا دھواں
جو نہ تھم سکتا کبھی، رن میں وہ طوفاں دیکھا
اثر حشر حد غم میں نمایاں دیکھا

حدت مہر سے تپتا ہوا صحرا دیکھا خون سادات کا بہتا ہوا دریا دیکھا
زد پہ برچھی کی جو ٹھہرے وہ کلیجا دیکھا کیا بتائے کوئی عاشور کو کیا کیا دیکھا
عقل باطل کی جو بہکی رہِ حق بھول گئی
عکس مقتل کا جو پھیلا تو شفق پھول گئی

دن کے پردے پہ شبِ تار ابھر آئی تھی دشتِ پُرخار میں ہر سمت خزاں چھائی تھی
چشمِ نرگس بھی اس اندوہ میں بھر آئی تھی ایسا سناٹا کہ تنہائی بھی گھبرائی تھی
چشمِ فطرت میں تڑپتے ہوئے آنسو دیکھے
شب کے کاندھوں پہ جو بکھرے تھے وہ گیسو دیکھے

آندھیاں سرخ اٹھیں زلزلے آئے پیہم جن و انساں میں بپا ہوگیا شورِ ماتم
سینۂ کوہ پہ تھا بارِ گراں بارِ الم خون رو رو دیا اس بوجھ سے قلبِ محکم
ہائے وہ وقت کہ جمشیدؔ لرزتا تھا جہاں
خون تازہ ہوا اسلام کہ شہؑ رگ سے رواں

نوحوں کے چند اشعار

دیکھتے ہیں شاہِ دیں تقدیر کو دفن کرکے اصغرؑ بے شِیر کو
لٹ نہ جائیں ماں کی ساری حسرتیں کوئی روکے آنے والے تیر کو
گھر لٹا کر راہِ حق میں اے حسینؑ دی بلندی دین کی تعمیر کو
ہے تمنا دل میں اے جمشیدؔ یہ جاؤں میں بھی زیارتِ شبیرؑ کو

چلے ہیں لاش اکبرؑ کی اٹھانے شہِؑ دیں ہمتِ دل آزما کے
گلے خنجر سے ملنے جارہے ہیں خدا کے عشق میں بندے خدا کے
نہاں ہوتے ہیں اصغرؑ زیرِ تربت ستارہ ڈوبتا ہے جھلملا کے
سنبھالا دل کو اپنے ماں نے اصغرؑ تصور میں تمھیں جھولا جھلا کے
نمایاں رہتے ہیں جمشیدؔ جلوے نگاہِ شوق میں کرب و بلا کے

اے حسینؑ اے تشنہ کامِ کربلا رکھ لیا دنیا میں نام کربلا
مرمٹو حق اور صداقت کے لیے مختصر یہ ہے پیامِ کربلا
آندھیاں، تاریکیاں، اور زلزلے تھی قیامت خیز شامِ کربلا
دل کے ہرذرے میں ہے عشق حسینؑ ہوں ازل سے میں غلامِ کربلا
اے شہِؑ دیں تشنہ لب جمشیدؔ ہے دو مئے کوثر بجامِ کربلا

ساحرؔ لکھنوی نے اپنے ابتدائی دور میں جن اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ان میں صرف سلام، نوحہ اور غزلیں کہیں اس دور کی غزل کا کوئی نمونہ حاصل نہیں ہوسکا، پاکستان میں دس برس تک شاعری کا سلسلہ منقطع رہا۔ ۱۹۶۵ء سے شاعری کا سفر دوبارہ جاری ہوا اور مرتے دم تک منقطع نہیں ہوا، یہاں شاعری کے ساتھ تحقیقی وتنقیدی مضامین کے لکھنے کا آغاز ہوا، ان کے مضامین ''پیام عمل'' ''ذوالفقار'' ''طلوع افکار''، ''رثائی ادب'' ''حدیث دل''، دہلی وغیرہ میں شائع ہوئے، یہ تمام مضامین ان کے انتقال کے بعد شائع ہونے والی کتاب ''نگارشات ساحرؔ'' میں شائع ہوچکے ہیں ان مضامین کے علاوہ جن موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں ان میں ''خانودہ اجتہاد کے مرثیہ گو ساحرؔ سے ماہرؔ تک'' فنِ تاریخ گوئی کا فنی فکری جائزہ''، مرثیہ پر اعتراضات کا تنقیدی جائزہ''، ''برصغیر میں تشیع اور اجتہاد'' (تذکرہ علمائے اجتہاد) شامل ہیں،

یہاں ساحرؔ لکھنوی صاحب کی چند نظموں کا تذکرہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس میں سرفہرست نظم بعنوان ''اے حرم'' ہے جو انہوں نے ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ کے حج کے بعد مکہ مکرمہ کو خطاب کرتے ہوئے کہی؛ یہ نظم پیام عمل لاہور اور الامیر کراچی میں شائع ہوئی ترجیع بند میں کہی گئی اس نظم کے آٹھ بند ہیں، اس نظم میں خانہ کعبہ کے مختلف مقامات کا ذکر ہے؛ صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیں

کھل گئی ہے اک نئے در کی طرح تیری جدا — مجھ کو یہ منظر تصور نے دکھایا بار بار
دستِ اقدس پر علیؑ، شاخِ رسالتؐ پر ہے پھول — اور اندر کی طرف تشریف فرما ہیں رسولؐ

کُلِّ ایماں ہے بدست رحمۃ اللعالمینؐ
یا رسالتؐ کی انگوٹھی پر امامتؑ کا نگیں

دیکھتے ہیں شوق سے ایک دوسرے کو دم بہ دم — ہے رسولِؐ پاک کے ہاتھوں پہ مولودِ حرم
کر رہا ہوں یہ دعا، اے خالقِ ہر بحر و بر — اور میں اس در کے دونوں بازوں کو تھام کر

تجھ کو تیرے اس رسولِؐ محترم کا واسطہ
میرے مالک تجھ کو مولودِ حرم کا واسطہ

میرے حج کو، میری اک اک سعی کو مشکور کر — گو مرا کوئی عمل بھی تو نہیں ہے معتبر
اور دوزخ سے بچالے مجھ کو اے مالک مرے — بخش دے میرے گنہ صدقے میں اس مولود کے

کھول دے معبود میرے واسطے جنت کا در
اور جہنم سے مجھے حرؑ کی طرح آزاد کر

اپنی رحمت سے مرے دامن کو بھردے اے خدا — تیرے درسے ہاتھ خالی جائے کیوں تیرا گدا
دے سبھی کو اے خدا نارِ جہنم سے نجات — حج بجا لائے ہیں جو جو مومنین و مومنات
اے رحیم و اے کریم، اے لم یزل اے لایزال — کر قبول ایک ایک کا حج اے خدائے ذوالجلال
اے مکان لامکاں، اے خانۂ حق آفریں — اے حرم اے جلوہ گاہ نور رب العالمین

ان کی دوسری نظم جو غیر مطبوعہ ہے بعنوانِ ''سوزخوانی'' جو ۱۹۴ اشعار پر مشتمل ہے، اس نظم کے آغاز سے چند اشعار

جس سے روشن ہیں فکروفن کے دیار — کربلا ہے وہ مطلع انوار

مجلسِ ذکرِ سیّدالشہدا — ہے اسی کربلا کی ایک عطا
مجلسِ غم یہ جب ہوئی آباد — فن کئی طرح کے ہوئے ایجاد
مجلسوں ہی سے روشناس ہوا — مرثیہ ہو ، سلام ، یا نوحہ
مرثیہ گوئی کا ہوا جو رواج — مرثیہ کو بھی مل گئی معراج
مرثیہ بن گیا ادب کی جان — اس سے اردو کی اور بڑھ گئی شان

آغازِ فنِ سوزخوانی سے متعلق چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

مجلسیں تھیں جو درد و سوز نہاد — سوزخوانی کا فن ہوا ایجاد
جن کو آتا تھا فنّ موسیقی — کی توجہ ادھر انہوں نے بھی
راگ کچھ درد ناک چن چن کر — مرثیوں میں سموے سر تا سر
اس کو رکھنا تھا جو غنا سے جدا — ساز کو سوز سے الگ رکھا
یوں کمالاتِ فن دکھانے لگے — جادو آواز کا جگانے لگے
لوگ جو زیر وبم سے واقف تھے — ان کو اس فن کی داد دینے لگے

(کچھ اشعار حذف کرتے ہوئے)

سوزخوانی جو بن گئی اک فن — اور بڑھنے لگی پھر اس کی لگن

(جب سوزخوانی کا عروج ہوا تو اس فن کو مجلسوں میں کیا مقام ملا)

سوز خوانی جو غم کی ہے غماز — مجلسوں کا اس سے ہے آغاز
سوز خواں سوز جب سناتا ہے — ایک غم کی فضا بناتا ہے
اس سے آغاز ہو جو مجلس کا — لوگ بہرِ نمازِ عشق و وفا
گھر سے چلتے ہیں سوئے بزم عزا — مجلسوں کی اذان ہے گویا
یہ سمجھتا ہے ہر صغیر و کبیر — ہے یہ اعلان مجلس شبیرؑ
حرف آغاز رنج و ماتم و آہ — مصحف کربلا کی بسم اللہ

اس شعر کے بعد مطلعِ دوم ہے جس میں سوزخوانی کی تاریخ اور سوزخواں حضرات کا ذکر منظوم ہوا ہے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں

اس ہنر میں ہوئے بفضل خدا — ایک سے ایک سوز خواں پیدا
اولیں با کمال صاحبِ فن — میر سیّد علی بہارِ چمن
یار خاں اور میر بندہ حسن — تھے بڑے بے نظیر ماہرِ فن
ایک سجادؔ ان میں تھے ماہر — نادرِ روزگار تھے نادر
منجھ گئے فن میں یوں بفضلِ خدا — منجھو صاحب کا تو جواب نہ تھا
مصحفی سا وہ شاعرِ یکتا — ماہرِ فنّ سوز خوانی تھا

قدیم سوز خواں حضرات کے بعد ساحؔر صاحب نے پاکستانی سوز خوانوں کا تذکرہ ان اشعار میں کیا ہے

بن گیا جب یہ ملک پاکستان — مجلسوں کی یہاں بھی بڑھ گی شان
سوز خوانی کا بھی رواج بڑھا — فن یہ اہلِ ہنر کا تاج ہوا
چند معروف سوز خواں جو ہوئے — نام زندہ ہیں ان کے اس فن سے
کاظمی صاحب ، آفتاب علی — آفتاب اس فلک کے بھی تھے وہی
ایک مقصود مرزا آغا تھے — گوہرِ تاجِ اہلِ فن جو ہوئے
تھے جو مسعود مرزا صاحبِ فن — ان سے اس فن کا نام تھا روشن
جن کا فن تھا عظیم وہ محسن — فن تھا ان کا جوان ، وہ تھے مسن
آغا داؤد اور تقی بابا — ان کا اس فن میں تھا بڑا پایا
ایک اختر وصی علی مرحوم — جن کی اس فن میں چار دانگ تھی دھوم
فن میں اب یاد گار ہیں ان کی — سبطِ جعفر بھی اور راحت بھی
نازشِ انجمن ہیں یہ دونوں — راحتِ جانِ فن ہیں یہ دونوں
اک تھے دیوان جی امیر حسن — خاص انداز کے تھے ماہر فن
ایک اوسط تھے پہلے ایک ہیں اب — جن کے شہرے تھے اس ہنر کے سبب
ایک مظاہر تھے ایک مظاہر ہیں — خاص اس فن کے آج ماہر ہیں
ایک زائر تھے کل تو ایک ہیں آج — جن سے ہے آسماں پہ فن کا مزاج
ایک فائق حسین سے لائق — ہیں جو اس فن میں لائق و فائق
ہوں دلاور کہ ہاتف و ابرار — ان سے اس فن کے رخ پہ اب ہے نکھار
ماہرِ فن سعید حیدر ہیں — صدفِ بحرِ فن کے گوہر ہیں
ایک شیدا حسن ہیں جانِ چمن — اک رضا جعفری ہیں صاحبِ فن
محتشم ہوں کہ مہدیِ مسعود — ان کے دم سے ہے چمن کی نمود
اور بھی ہیں بفضلِ ربِّ عُلا — جن سے ہے زیب و زینِ بزمِ عزا
ہو چکے اس جہاں سے جو رخصت — اب انہوں نے بسائی ہے جنت
سوز خوانی کی خدمتوں کے سبب — خدمتِ شاہِؒ کربلا میں ہیں سب
اب جو خدمت پہ فن کی ہیں معمور — قائم ان سب کو رکھے رب غفور

مقطع

ساحؔر بے ہنر کی ہے یہ دعا
کہیں آمین مل کے اہلِ عزا

۲۸/اشعار پر مشتمل نظم بعنوان ''قلم اور موقلم''، معروف مصور وخطاط صادقین امروہوی کی شخصیت وفن سے متعلق ہے چند اشعار ملاحظہ

فرمائیں۔

ابتدا میں قلم کی تعریف میں چند اشعار

قلم تخلیق حرف ''کن فکاں'' ہے قلم فکرمشیت کی زباں ہے
ازل میں کاتبِ تقدیر نے بھی اسی سے لوح پر تقدیر لکھی
یہی ہے کاشفِ راز حقیقت یہی ہے کاتبِ احکامِ قدرت

موقلم کی مدح میں چند منتخب اشعار

قلم کا ایک جلوہ موقلم ہے یہی صورت گرِ ہر کیف و کم ہے
وہ کلکِ کاتبانِ خوش رقم ہے مصور کا قلم یہ موقلم ہے
قلم اور موقلم ایسے حشم کا قلم تھا صادقینِ حق رقم کا
قلم گوید کہ من شاہ جانم بدست صادقین جان جانم

''التجائے شرکتِ غم'' کے عنوان سے ساحرؔ لکھنوی صاحب نے ایک نظم اپنی والدہ ماجدہ نواب شہر بانو صاحبہ کے چہلم کے موقع پر اطلاع مجلس کے اشتہار کی صورت میں لکھی ۴۷ اشعار کی اس نظم کو شخصی مرثیہ کہا جاسکتا ھے ابتدا میں ماں کی عظمت میں اشعار ہیں اور پھر ایک بیٹے سے ماں کی محبت اور زندگی بھر جو مرحومہ نے اپنے کنبے، بچوں کی پرورش ان کے لاڈ اٹھانے میں جو زحمتیں برداشت کیں انہیں منظوم کیا ہے

منتخب چند اشعار

شکر ہے اللہ کا واجب ہر اک انسان پر جس نے کی ماں جیسی نعمت خلق بہر ہر بشر
اس زمیں پر زیست کے آثار کی ضامن ہے ماں ماں نہ ہو تو زندگانی کا تصور ہی کہاں
ماں کے دم سے ہے ہر انساں کا وجود اس کی بقا ماں کے صدقے میں ہے جاری زندگی کا سلسلہ
ماں کا سایہ بھی ہے ظلِّ رحمت پروردگار چھاؤں جس کی ہے بڑی ٹھنڈی وہ نخلِ سایہ دار
حوصلہ اولاد کو دیتی ہے وقتِ امتحاں دھوپ میں غم کی وہی ہے مامتا کا سائباں
مامتا محدود کب ہے طفل ناداں کے لیے لاکھ بوڑھا ہو مگر بچہ ہے وہ ماں کیلئے
طفلِ نو ہو یا مصیبت میں کوئی پیر و جواں ہے اسے آغوشِ مادر ہی فقط جائے اماں

بے شک اس دنیا میں جو آتا ہے ، جانا ہے اسے ہے یہی قانون قدرت ساری خلقت کے لیے
موت ہے سب کیلئے ، قدرت کا یہ اعلان ہے جب تو قرآں میں یہ کل من علیہا فان ہے
نعمتیں چھن جائیں تو شکوہ ہمیں زیبا نہیں کلیہ یہ وہ ہے جس سے ماں بھی مستثنٰی نہیں
دردِ دل اُٹھتا ہے رہ رہ کر اسی تدبیر میں یہ ہمارا غم بھی مل جائے غمِ شبیرؑ میں
اس لیے یہ طے ، کیا اک مجلسِ شبیرؑ ہو جون کی نو ، ماہ ذلحجہ کی اٹھائیس کو
آپ اگر ہوں گے شریکِ مجلسِ شبیرؑ میں رنگ بھر دیں گے ہمارے درد کی تصویر میں

غم زدوں کے غم میں شرکت ہے بڑا کارِ ثواب زحمتیں تھوڑی سی ہیں رحمت خدا کی بے حساب
مرہم اشکِ عزا لے کر جو آپ آجائیں گے مادرِ شبیرؑ سے بھی اجر اس کا پائیں گے
آپ کی شرکت کا اس بزمِ عزا میں ملتجی غم نصیب و مبتلائے رنج ساحرؔ لکھنوی

ساحرؔ لکھنوی صاحب نے ایک منظوم دعوت ولیمہ اپنے بیٹے سید محمد مہدی دانش کا بھی تصنیف فرمایا تھا۔ جس کے دو ابتدائی اشعار یہاں درج کر کے آگے مختصر قصائد کی طرف بڑھتا ہوں

اللہ الحمد یہ ہم پر کرم عزوجل جس کے احسان کا بدلہ ہے نہ رحمت کا بدل
اس کے محبوب کا سایہ ہے ہمارے سر پر جس کے گھر آئے علی خلق کے مولا بن کر

مقطع

منتظر آپ کی شرکت کے بروزِ شادی
ساحرؔ لکھنوی و مادرِ دانش مہدی

اصنافِ سخن میں، قصیدہ گوئی ساحرؔ صاحب کی محبوب ترین صنف ہے جب انہوں نے اپنا پہلا مجموعہ قصائد ''صحیفۂ مدحت'' مرتب کیا تو تقریباً ۵۰ صفحات پر مشتمل ایک تحقیقی مضمون ''قصیدہ۔ عربی سے اردو تک'' ایک اجمالی تحقیقی مطالعہ شامل اشاعت کیا، جس میں انہوں نے قصیدہ کی تعریف، قصیدہ کے اجزاء، قصیدہ کی ہیئت کے بعد قصیدہ کیلئے تعداد اشعار پر مختلف محققین کی آرا کو شامل کیا اس میں انہوں عربی لغت قاموس، صاحب منتخب اللغات، دبیرِ عجم، کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ قصیدہ میں اشعار کی کم سے کم تعداد تین (۳) ہے ان تمام آرا کو نظر میں رکھتے ہوئے ساحرؔ صاحب لکھتے ہیں

''اجزائے ترکیبی اور اس کے مقاصد کے تناظر میں ان آرا کا جائزہ لیا جائے تو تین، پانچ، سات، یا دس اشعار پر قصیدے کا اطلاق کرنا میرے (ساحرؔ) نزدیک درست نہیں ہے''

اس تحریر کے بعد انہوں نے سوچا قصیدہ کے لیے تین اشعار کس طرح ممکن ہو سکتے ہیں تو انہوں نے ایک تجربہ اس وقت کیا کہ جب انھیں غلام حسنین زیدی کے گھر منعقدہ محفل کے لیے مصرعۂ طرح ''حضرت عباسؑ سے زندہ ہوا نامِ وفا'' ملا اس مصرعہ طرح پر انہوں نے تین اشعار پر مشتمل مکمل مشبب قصیدہ کہا یہ محفل شعبان ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۸ نومبر ۲۰۰۰ء کو کراچی میں منعقد ہوئی، یہاں قصیدہ فروغِ مرثیہ کے قارئین کے لیے پیش کر رہا ہوں:-

درمدحِ حضرت ابولفضل العباسؑ

جب بہار آئی چمن میں لے کے پیغامِ وفا بن گیا ہر غنچۂ تر کھل کے اک جامِ وفا
اک گلِ عباسؑ نے مجھ سے کہا ساحرؔ لکھو اس کی مدحت ہو گیا ہے جس پہ اتمامِ وفا
میں نے یہ لکھا زمانہ جب تھا ناکامِ وفا حضرت عباسؑ سے زندہ ہوا نامِ وفا

اس کے بعد دو اور قصائد انہوں نے تصنیف فرمائے ایک ''در مدحِ تاجدارِ اقلیم وفا'' اور ''قصیدۂ درِ مدحِ مولائے کائنات برائے جشنِ قدیر''

وطن سے ہجرت کے بعد ساحر لکھنوی صاحب متعدد مرتبہ ہندوستان گئے خصوصاً لکھنو میں مرثیے پیش کیے، کسی ایک مجلس میں انہوں نے اہلیانِ لکھنؤ کو مخاطب کر کے ایک نظم ۱۱۴ اشعار پر مشتمل کہی، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

السلام اے سامعین و شاعرانِ لکھنؤ　　صاحبانِ نکتہ سنج و نکتہ دانِ لکھنؤ
کورنش ، تسلیم ، مجرا ، بندگی ، آداب عرض　　ساکنان خطہ جنت نشان لکھنؤ
کیوں نہ ہو تسنیم و کوثر سے دھلی میری زباں　　حق نے میرے منہ میں رکھ دی ہے زبانِ لکھنؤ
یا الٰہی حشر تک قائم رہیں یہ رونقیں　　یہ عزاخانے ہے جن سے عزّ و شانِ لکھنؤ

۲۸ ستمبر ۱۹۹۸ء کو سفینۃ الہدائیہ ٹرسٹ کی جانب سے ''گوپی ناتھ امن صدی'' کی منعقد تقریب میں ساحر لکھنوی نے صدارتی مقالہ بعنوان ''گوپی ناتھ امن اور عشقِ حسینؑ'' پیش کیا یہ مقالہ میری معلومات کے مطابق غیر مطبوعہ ہے اس مختصر سے مضمون کا مقصد صرف یہ بتلانا ہے کہ ساحرؔ صاحب نے نہ صرف شاعری کی جملہ اصناف میں طبع آزمائی فرمائی بالکہ نثری اصناف میں بھی اپنے ذہن وفکر کے مضبوط آثار چھوڑے ہیں، لائقِ مبارک باد ہے ہیں وہ ادارے جنہوں نے ساحرؔ صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اعزازات سے نوازا خصوصاً ہندوستان سے انہیں امام صادقؑ مشن'' کی جانب نے ساحر لکھنوی کے شایان شان خطاب سیّدالشعرا سے نوازا گیا، پاکستان میں ادارۂ سفیرانِ علم کی جانب سے ''نشانِ اعزاز'' ان کی علمی خدمات کے طور پر دیا گیا، زندگی نے ساتھ دیا تو آئندہ ساحرؔ صاحب کی غیر مطبوعہ اصناف سے انتخاب آپ قارئین کی خدمت میں پیش کروں گا۔

❁❁❁❁

جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیوں پر مشتمل

''فرہنگِ جوشؔ'' شائع ہو گئی ہے

(جس میں جوشؔ صاحب کے ۹ مرثیوں سے ۱۲۰۰ سے زائد الفاظ منتخب کیے گئے ہیں)

ترتیب وتدوین

اصغر مہدی اشعر

مرثیہ قیامت

علی عرفانؔ

گفتگو وہ ابتدا توحید سے جس کی ہوئی گفتگو منطق کے سائے میں اصولِ دین کی
شکرِ خالق آ گئی وہ تا مقامِ آخری (۱) عدل کے رستے نبوت اور امامت تک گئی
فکر و احساس و نظر کو اب جھنجھوڑا جائے گا
تذکرہ محشر کا اب لفظوں میں ڈھالا جائے گا

یومِ فصل و یومِ دین القاب اس کی شان میں وہ قیامت ذکر جس کا جا بہ جا قران میں
نیک و بد افعال تولے جائیں گے میزان میں (۲) ساری خلقت جمع ہوگی جبکہ اک میدان میں
نامۂ اعمالِ اہلِ حشر کھولا جائے گا
پُل پہ ''مسعولون'' کہہ کر سب کو روکا جائے گا

اک مکان و وقت پر ہو جمع خلقت کس لیے اک سوال اٹھتا ہے ذہنوں میں قیامت کس لیے
تابہ محشر انتظارِ نار و جنت کس لیے (۳) بعدِ قبضِ روح یہ برزخ کی مدت کس لیے
رب جو چاہے سُوئے شادی یا سوئے غم بھیج دے
مرتے ہی انساں کو جنّت یا جہنم بھیج دے

دور تک جاتا ہے انساں کے عمل کا سلسلہ عقل نے دی یہ صدا اے ابنِ آدم سن ذرا
ہاں یہی تو ہے ثوابِ جاریہ کا فلسفہ (۴) مثل لہروں کے اثر کا پھیلتا ہے دائرہ
ہر ثوابِ توبہ میں آدم کا حصہ ہے ضرور
قتلِ ناحق جو بھی ہو قابیل کا ہے کچھ قصور

ظلم کچھ تم پر ہوئے کچھ ظلم تم نے بھی کیا تم نے کچھ احساں کیے کچھ تم پہ احساں بھی ہوا
بزمِ اسباب و علل کا جب ہے ایسا ماجرہ (۵) ہے تمھارا حق کسی پر تم پہ حق ہے اور کا
ہو مکمل حُجّتِ انصاف داور اس لیے
ہے ضروری اجتماعِ اہلِ محشر کے لیے

اس سے پہلے ساری دنیا ظلم سے بھر جائے گی ہاں قیامت آئے گی اور ساتھ محشر لائے گی
بعد صد در صد مہینے لیلۃ القدر آئے گی (۶) دفعتاً بادِ بہاری جھوم کر لہرائے گی
خانۂ حق کے صدف سے ایک گوہر آئے گا
پردۂ غیبت الٹ کر ابنِ حیدرؑ آئے گا

اب غدیرِ خم کا منظر پہنچے گا تکمیل تک مومنوں کا کیف آخر پہنچے گا تکمیل تک
اشتیاقِ سیفِ حیدرؑ پہنچے گا تکمیل تک (۷) انتقامِ خونِ سرورؑ پہنچے گا تکمیل تک
مثلِ قطرہ بحر بے پایاں کی اٹھتی موج میں
اے خوشا قسمت جو ہم ہوں شاہِؑ دیں کی فوج میں

اُٹھ کے کعبے سے مرا مولا مدینہ جائے گا قربِ پیغمبرؐ سے اعدا کو اٹھایا جائے گا
جاری کی جائے گی حد لاشوں کو پیٹا جائے گا (۸) مومنوں کے دل کا کانٹا یوں نکالا جائے گا
اہلِ ایماں مدحِ مولا کے ترانے گائیں گے
آسماں سے تہنیت دینے کو عیسیٰؑ آئیں گے

منزلیں طے ہوتی جائیں گی قیامِ دین کی ہوگی رجعت آئیں گے پھر سے نبیؐ آخری
اور علیؑ و فاطمہؑ بھی شبرؑ و شبیرؑ بھی (۹) پھر سے دنیا جلوہ گاہِ پنجتنؑ بن جائے گی
جنگ ہوگی اور مٹے گا کفر بھی طغیان بھی
وقت آئے گا تو مارا جائے گا شیطان بھی

پھر تو راوی انس و جن کے واسطے لکھّے گا چین فقر ہوگا اور نہ فاقہ اور نہ بیماری نہ دین
ہوگی چوری اور نہ ڈاکہ چاہے دن ہو چاہے رین (۱۰) آدمیت جلوہ گر ہوگی بہ عزو زیب و زین
علم کے پھولوں کی پھیلی ہوگی نکہت چار سو
ذکرِ اہلِؑ بیت ہوگا ہوگی راحت چار سو

راحتوں کے گُل بھی لیکن ایک دن مُرجھائیں گے صور پھونکا جائے گا اور سب کے سب مر جائیں گے
صور کی آوازِ ثانی جب فضا میں پائیں گے (۱۱) مُردے اپنی اپنی تربت سے نکل کر آئیں گے
صور کی آواز ہیبت ناک ہوگی کان میں
جمع ہوجائے گی خلقت حشر کے میدان میں

یہ وہ میداں ذکر سے جس کے تھے لرزاں انبیاؑ جنتِ و دوزخ کا ہوگا اس جگہ پر فیصلہ
سب گناہوں نیکیوں کو آج تولا جائے گا (۱۲) ہر بشر کو آج دینا ہے حساب اعمال کا
زندگی کے ایک اک لمحے کا دنیا ہے حساب
کون اب ناکام ہوگا کون ہوگا کامیاب

جب امید و بیم کے عالم میں ہوں گے سب بشر سوچ کر انجام اپنا ہوں گے لرزاں اہلِ شر
سر سے تا پاؤں بدن ہوں گے عرق میں تر بہ تر (۱۳) اُس گھڑی دے گا منادی یہ ندا افلاک پر
اہلِ محشر جلوۂ انوارِ باری دیکھ لو
مرسلِؐ آخر کی آتی ہے سواری دیکھ لو

کچھ عجب انداز سے آئیں گے شاہِؑ نامدار آگے آگے ان کے ہوں گے مرتضیٰؑ با افتخار
دستِ حیدر میں لوائے حمد ہوگا جلوہ بار (۱۴) سب پیمبرؑ اور فرشتے کہہ اٹھیں گے ہم نثار

اللہ اللہ آج شانِ کبریائی دیکھ لو
یہ وہ ہیں قبضے میں جن کے ہے خدائی دیکھ لو

برسرِ محشر صدا آئے گی اس دم ناگہاں مصطفیٰؐ و مرتضیٰؑ کی آج دیکھو عزّ و شاں
دوست ان کے آج ہوں گے کامیاب و شادماں (۱۵) اور رسوائی یقیناً ہے نصیب دشمناں

سنتے ہی رخ ہوں گے روشن دوستانِ شاہؑ کے
کالے پڑ جائیں گے چہرے دشمنانِ شاہؑ کے

اک عظیم الشان منبر نصب ہو گا پھر وہاں جلوہ فرما ہوں گے اس پر دونوں شاہانِ شہاں
حشر کے میداں میں ان کا نور ہوگا ضو فشاں (۱۶) حکمِ حق سے ہوگا پھر ذکرِ امیرِؑ مومناں

دو فرشتے یہ صدا دیں گے کہ اب جانو اسے
یہ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ ہے پہچانو اسے

جنت و دوزخ کے داروغہ وہاں پر آئیں گے کنجیاں نار و جناں کی پیشِ احمدؐ لائیں گے
کر دو حیدرؑ کے حوالے مصطفیٰؐ فرمائیں گے (۱۷) جنّت و دوزخ بھی اس دم فخر سے اترائیں گے

ہوں علیؑ کے دوستوں کا گھر یہ بولے گی جناں
اور جہنم یہ کہے گا میں ہوں بہرِ دشمناں

لے کے پھر اُن کنجیوں کو باوقار و افتخار ہوں گے حیدرؑ آخری حدِّ جہنم پر سوار
ہوگی ان کے پاک ہاتھوں میں جہنم کی مہار (۱۸) جس طرف چاہیں گے موڑیں گے یہ ہوگا اختیار

یہ ندا دیں گے ملک مومن کا بیڑا پار ہے
ابنِ بوطالبؑ کے قبضے میں جناں ہے نار ہے

اہلِ محشر اس طرف پھر فوج در فوج آئیں گے سامنے سے مرتضیٰؑ کے وہ گذارے جائیں گے
آنے والا دوست ہوگا تو علیؑ مُسکائیں گے (۱۹) پھر جہنم سے مخاطب ہو کے یہ فرمائیں گے

دور ہو جا اب ادھر کی سمت آنا بھی نہیں
یہ ہے میرا اس کی جانب آنکھ اٹھانا بھی نہیں

اور جب چہرے پہ لے کر داغِ بغض و مکرو کیں دشمنِ حیدرؑ کوئی آئے گا دوزخ کے قریں
مرتضیٰؑ ڈالیں گے اس پر اک نگاہِ خشمگیں (۲۰) اور جہنم سے کہیں گے یہ ہے تیرا بالیقین

آگ کا شعلہ اسے فوراً اٹھالے جائے گا
مقصدِ تخلیق دوزخ کا سمجھ میں آجائے گا

آئے گا وہ وقت بھی جب یہ منادی آئے گی بند کرلو اپنی آنکھیں اہلِ محشر اس گھڑی
آنے والی ہے یہاں پر فاطمہؑ بنتِ نبیؐ (۲۱) آنے والی ہے یہاں پر زوجۂ مولا علیؑ
آئے گی زہراؑ تو ہوگی جاہ و حشمت ساتھ ساتھ
گرد ان کے ہوں گی حوریں بہرِ خدمت ساتھ ساتھ

اس سے آگے صاحبِ سبطین کا ہے یہ بیاں پہنچے گی میدانِ محشر میں جو خاتونِؑ جناں
اُن سے فرمائیں گے اس دم یہ امیرِ مومناں (۲۲) فاطمہؑ اے فخرِ مریمؑ بنتِ ختمِ المرسلاں
درد کا اِس اُمتِ عاصی کے درماں کوئی ہے
کیا شفاعت کا تمھارے ساتھ ساماں کوئی ہے

ڈال کر چشمِ کرم بر دوستانِ شاہؑ دیں باوقار و تمکنت بااعتبار و بایقیں
فاطمہؑ فرمائیں گی یہ اے امیرؑ المومنیں (۲۳) ساتھ میرے جو ہے سامانِ شفاعت کم نہیں
سب کی بخشش کے لیے کافی ہے یہ سوغات بس
میرے بیٹے میرے عباسِؑ جری کے ہاتھ بس

اب تصور کہہ رہا ہے ہوگی مجلس واں بپا حشر کے میداں میں آجائے گی کھینچ کر کربلا
پیشِ عادل فرشِ محشر پر بیانِ سیدہؑ (۲۴) سننے والے مصطفیؐ و مرتضیٰؑ و مجتبیٰؑ
اب قیامت میں قیامت دوسری آجائے گی
اپنی آنکھوں سے جو دیکھا فاطمہؑ بتلائے گی

فاطمہؑ یہ کہتی ہوں گی کیسے بھولوں گی بھلا خون میں ڈوبا ہوا وہ دامنِ کرب و بلا
میرا بچہ سر کٹا کر ریت پر سویا ہوا (۲۵) اور میری بیٹیوں کے سر سے چھنتی وہ ردا
گرد رخ پر ، کان زخمی ، بکھرے گیسو ، الاماں
چار سالہ ایک بچی اس کے آنسو الاماں

اس زمیں پر میں نے دیکھا ایک بچہ پھول سا حلق خوں میں تر مگر لب پر تبسم جیت کا
میں نے دیکھی خوں میں ڈوبی اک شبیہِ مصطفیؐ (۲۶) آسماں نے کیسے دیکھے یہ نظارے اے خدا
کس قدر تھا پُر وہ لمحہ درد کے احساس سے
خوں ٹپکتا میں نے دیکھا بازوئے عباسؑ سے

بعدِ کربل تا قیامت یہ رہا بس میرا کام مجلس و ماتم کا ہوتا جس جگہ پر اہتمام
جس جگہ اٹھتی صدائے یاحسینؑ و یا امامؑ (۲۷) میں وہاں موجود ہوتی تھی سحر ہو یا ہو شام
رونے والوں کو وہاں طوبیٰ لکم کہتی تھی میں
ان کے بہتے آنسوؤں کو پونچھتی رہتی تھی میں

''اُردو مرثیے میں نعتیہ عناصر''-ایک روشن نصاب

عادل مختار

آفاقیت اور تمام اصنافِ سخن کو سمو لینے کا حوصلہ اردو مرثیے کا امتیاز ہے۔اس ایک صنف میں تغزّل کی لطافت،مثنوی کی روانی،نوحہ کا سوز،نغمات کی ملائمت اور رجز کی گرج کے اعلیٰ ترین نمونے موجود ہیں کہ جو اردو ادب کا سرمایۂ فخر ہیں۔اگر تقدیسی ادب کی بات کی جائے تو ایسا وہ کون موضوع ہے کہ جو اردو مرثیہ کے احاطہ میں نہیں ہے۔حمد،نعت،منقبت کے ساتھ ساتھ فکرِ آخرت،دنیا کی بے ثباتی،اخلاق اور روحانیت پر مبنی مضامین اپنی بھر پور شان کے ساتھ اردو مرثیے میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام موضوعات مرثیوں میں شانِ اجمال کے ساتھ تخلیق کئے گئے ہیں۔مگر پروفیسر سیّد ضمیر حیدر نے ایک بھر پور تحقیقی مقالہ بعنوان ''اُردو مرثیے میں نعتیہ عناصر'' تحریر فرما کر اردو مرثیہ اور اردو نعت کے حوالے سے تحقیق کے نئے امکانات روشن کیے ہیں۔

مذکورہ عنوان اور اس پر ایک مفصّل تحقیقی مقالہ کے بعد اردو مرثیے میں تحقیق کے لیے کئی دوسرے راستوں کی طرف رہنمائی ہو رہی ہے مثلاً اردو مرثیے میں حمدیہ عناصر،اردو مرثیے میں تغزّل کے نمونے اور اردو مرثیے میں حماسہ کا اختصاص وغیرہ۔اس لحاظ سے ''اردو مرثیے میں نعتیہ عناصر'' اپنے موضوع تک ہی محدود نہیں بلکہ نہجِ فکر پر یہ کتاب اپنا ایک مستقل سفر رکھتی ہے۔

مرثیے کے علاوہ خود اردو مرثیے کے توسط سے موجودہ نعت کے اندر موضوعات اور مضامین کے جن امکانات کے باب وا ہوتے دکھائی دیتے ہیں میری نظر میں وہ امکانات ''اردو مرثیے میں نعتیہ عناصر'' کی اور ''قیمة کل أمر ما یحسنه'' کے تحت خود اس کتاب کے محقق و مرتّب کی اہمیت بھی ثابت کرتے ہیں۔

اردو مرثیے میں نعتیہ عناصر کے مطالعہ کے دوران ایک شدید احساس نے اپنی لپیٹ میں رکھا اور وہ احساس اس بات کا تھا کہ عموماً جب نعت اور نعتیہ کلام کا ذکر آتا ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شمائل اور ان کے کچھ مخصوص خصائل کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔یعنی حضورؐ کے گیسوئے مبارک،آپؐ کے رخسارِ انور آپؐ کی پیشانی اور آپ کا دہنِ اقدس اور آپ کے خصائل وصفات میں بھی ذکر آتا ہے تو آپؐ کی یتیم پروری،بیواؤں کا سہارا ہونا اور آپؐ کے وسیلے سے مرادوں کا پورا ہونا دماغ میں آتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ نعت میں عمومی طور پر اور تکرار کے ساتھ مدینہ شریف کی زیارت اور مدینے کے سفر کا شوق نعت کے عمومی موضوعات میں شامل ہیں۔مگر جب ہم اردو مرثیہ ایسی صنفِ سخن کو دیکھتے ہیں جو آفاقی بھی ہے اور تمام تر اصنافِ سخن کے بہتریں نمونوں سے معمور بھی ہے تو اس میں نعتیہ کلام،مسدس کے خاص آہنگ،فکر کی باریکی،مضمون آفرینی کے ساتھ آفاقی سطح پر نظر آتا ہے۔

اردو مرثیے میں نعتیہ عناصر کا مطالعہ جملہ اوصاف کی بناء پر نہ صرف اردو ادب کے طلباء کے لئے ضروری ہے بلکہ یہ دورِ جدید کے نعت

خواں ہو یا نعت گو شعراء، سب کے لیے یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ اردو کے مرثیہ نگاروں نے شاعری کو جس عروج پر پہنچایا ہے جب وہ نعت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہ نعت کے عمومی اور محدود مضامین اور موضوعات کو قبول کرنے کی بجائے اپنے عرفان، وجدان، فکری گہرائی اور ہنر کے ذریعہ سے نعت کو بھی وسعتِ موضوعات اور جدّتِ مضامین کے ذریعے وفاقی سطح پر متعارف کرواتے ہیں۔

اس کتاب میں نعت گوئی کی تاریخ اور اس کے علاوہ مرثیے کی تاریخ کے بعد قدیم مرثیہ نگاروں سے لے کر عصر حاضر کے معروف جدید مرثیہ نگاروں تک کے مرثیوں سے نعتیہ کلام کے نمونوں کو لے کر جس طرح مرتّب کیا گیا ہے وہ نہ صرف مرثیے کی قوّت اور وسعت کو ثابت کرتا ہے بلکہ خود پوفیسر سید ضمیر حیدر اپنے انتخابِ کلام کے باعث نعت اور مرثیے کے ارتباط سے عمومی نعت اور مرثیے میں موجود نعت کے مزاج میں امتیاز متعارف کروانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔

کتاب کی سیر کے دوران ''مرثیائی نعت'' کا مزاج اور آہنگ کا امتیاز اور اس کے موضوعات سے اسلوب تک کا ترفّع جس طرح نکھر کے سامنے آتا ہے اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

کتاب کے صفحہ ۲۴۱ پر انیس کے مرثیوں میں نعتیہ کلام کے نمونوں سے ایک بند پیش کرتا ہوں

مختارِ زمیں باعثِ افلاک نبیؐ ہے — والا گہرِ قلزمِ لولاک نبیؐ ہے
مصباحِ حریمِ حرمِ پاک نبیؐ ہے — شیرازۂ مجموعۂ ادراک نبیؐ ہے
عالم میں وہ آیا تھا پہ دل سوئے خدا تھا
حق اس کا رضا جو وہ رضا جوئے خدا تھا

حضورؐ کو جو ''شیرازہء مجموعہء ادراک'' کہا گیا تو اس سطح کا نعتیہ اظہار فقط انیس کے ذریعے مرثیہ میں ہی مل سکتا تھا۔

علمِ کلام اور فلسفہ کی دو اصطلاحیں ہیں ''حدُوث'' اور ''قِدم''، فارسی ہو یا اردو شعراء نے نعوت میں ان اصطلاحوں سے متشرّح مضمون کو سو رنگ سے باندھا ہے۔ عرفی نے کہا تھا:

تقدیر بیک ناقہ نشایند دو محمل
سلمائے حدوثِ تو و لیلائے قدم را

مگر اس مضمون کو تکرار کے باوجود جس کمال سے اردو مرثیہ نگاروں نے باندھا ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

مرزا دبیر کا ایک بند اس ضمن میں ''اردو مرثیہ میں نعتیہ عناصر'' کے صفحہ ۱۴۵ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

حادث کے لیے شرط تغیّر کی ہے مرقوم — پر مردہ بہ از زندہ ہے یہ عاشقِ قیّوم
باقی ہے نبوّت کا وہی اوج وہی دھوم — اس بات سے اثباتِ قدم ہو گیا مفہوم
ہستی میں جو تھا بعدِ فنا بھی وہ حشم ہے
لا ریب حدوثِ شہِ لولاک قِدم ہے

اور تمکین امروہوی کا ایک بند اس ضمن میں صفحہ ۱۹۷ پر درج ہے

خلّاقِ جہاں کا کرم و جُود نبیؐ ہیں　　ہستی کی نمود اور سببِ لود نبیؐ ہیں
عالم کے لیئے رحمتِ معبود نبیؐ ہیں　　ساجد ہیں ملک جس کے وہ مسجود نبیؐ ہیں
حادث تو ہیں لیکن ہمہ تن نورِ خدا ہیں
پرتو سے قِدم کے ابداً جلوہ نما ہیں

جب یہی مضمون نسیم امروہوی تک پہنچتا ہے تو کلام سے ہٹ کر مزید شاعرانہ ہوجا تا ہے۔ کتاب کے صفحہ ۶۱۳ پر نسیم صاحب کا بند ہے۔

وہ کردگار ، یہ سندِ ذاتِ کردگار　　وہ طُور ہے یہ نور وہ جلوہ یہ جلوہ زار
وہ خلق یہ خلیق وہ حق اور یہ حق گزار　　وہ شاہدِ قِدم یہ حدوث اور سدا بہار
وہ اسمِ ذات ہے تو یہ جسمِ صفات ہیں
وہ حی لایموت یہ مر کر حیات ہیں

حدوث اور قدم کی اصطلاحوں کا استعمال تو فقط ایک مثال ہے۔ اس حوالے سے بھی یہاں صرف تین مثالیں پیش کی گئی ہیں جبکہ اس ایک مضمون پر اسی مقالے میں کئی دیگر بند درج ہیں اسی سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس ایک مضمون پر اردو کے کل مرثیوں میں کس قدر مواد موجود ہوگا۔ اس کے علاوہ اس مقالے کے مطالعے دوران اردو مرثیے میں نعت کے عمومی مضامین مثلاً میلاد، معراج، ہجرت اور اسمِ رسولِ پاکؐ پر قدیم اور جدید فکر مبنی شاعری کے اعلیٰ نمونے جا بجا نظر سے گزرتے ہیں اور یہ خود کتاب کے مؤلف کے ذوق، جستجو اور محنت کی غمازی کرتے ہیں۔

نعت کے عمومی اور مکرّر مضامین سے ہٹ کر جن موضوعات پر نعتیہ کلام مرثیے میں تخلیق کیا گیا ہے اس کی مثالیں سید آل رضا، نسیم امروہوی علّامہ جمیل مظہری، ڈاکٹر ہلال نقوی، یاور عباس صاحب اور وحید الحسن ہاشمی ایسے صاحبانِ فکروفن کے مرثیوں خصوصی طور پر ملتی ہیں۔

جمیل مظہری کے مرثیوں میں نعتیہ عناصر ایک بھرپور انسانی تاریخ کے شعور کے ساتھ عمل میں آتے ہیں۔ کتاب کے صفحہ ۲۷۷ پر جمیل مظہری کے کلام سے ایک بند پیش کیا جارہا ہے۔

جس سے پہلے عملاً قیدِ محن تھا مذہب　　ایک زنبیلِ روایاتِ کہن تھا مذہب
ذہنِ افسردۂ انساں کی تھکن تھا مذہب　　زندگی لاش تھی اور اس کا کفن تھا مذہب
ترکِ دنیا تھی بزرگی کی سند دنیا میں
کھد رہی تھی بشریت کی لحد دنیا میں

وحید الحسن ہاشمی صاحب کے ایک مرثیے میں موجود نعتیہ بند صفحہ ۵۹۳ سے نقل کیا جاتا ہے جو جدید شعور کے باوجود اپنی جڑیں روایت اور گہرے مذہبی شعور میں رکھتا ہے۔

جمہوریت کا نام و نشاں نامِ مصطفیٰؐ　　وجہِ سکونِ خلق ہے پیغامِ مصطفیٰؐ
جس نے سنبھل سنبھل کے پیا جامِ مصطفیٰؐ　　پہنچا اسی کو وعدۂ انعامِ مصطفیٰؐ
اک بے خبر شعور کی میزان ہو گیا
انساں درِ رسول پہ سلمان ہو گیا

ڈاکٹر ہلال نقوی صاحب جدید مرثیے کی تحقیق اور تخلیق کا نمائندہ نام ہیں اور ممتاز فکر و اسلوب رکھتے ہیں۔ان کے مرثیے ''ہاتھ'' کا ایک نعتیہ بند صفحہ ۴۰۷ پر درج ہے جو جدید فکر کے ساتھ وسعتِ ذاتِ سرورؐ کا عرفانی پہلو بھی رکھتا ہے۔

اور مصطفیٰؐ کے ہاتھ فضا پر محیط ہیں خاک و خلا و آب و ہوا پر محیط ہیں
ان کے حصار میں ہیں زمانے کی گردشیں یہ کائناتِ ارض و سما پر محیط ہیں
فرشِ عظیم و عرشِ معظّم لیے ہوئے
یہ دونوں ہاتھ وزنِ دو عالم لیے ہوئے

اگر موجودہ زمانے کی بات کی جائے تو دو شعرا بہت منفرد اور نادر تفکرات کے حوالے سے نظر سے گزرتے ہیں اور دونوں ہی کمیل تخلص رکھتے ہیں۔ان میں پہلے کمیل شفیق رضوی الہ آباد بھارت سے تعلق رکھتے ہیں اور ندرت ان کے کلام کا خاصہ ہے۔حضرتِ حُرؑ پر مرثیے میں حُرؑ کی زبانی جو نعت کہلواتے ہیں وہ اس کتاب کے صفحہ ۲۲۵ پر درج ہے۔

میں سبطِ محمدؐ کی ثنا چاہ رہا ہوں یعنی کہ پیمبر کی دعا چاہ رہا ہوں
خورشیدِ مدینہ سے ضیا چاہ رہا ہوں میں بزم گہِ نعت میں جا چاہ رہا ہوں
سرکار دو عالم کی شفاعت مجھے مل جائے
یثرب کی اسی راہ سے جنت مجھے مل جائے

خیامِ حُسینی کو بزم گہِ نعت کہنا،نعت کا اس قدر جداگانہ تخلیقی بُعد کا روشن ہونا یہ مرثیے کی فضا ہی میں ممکن تھا۔

اس کتاب میں مذکور آخری مرثیہ نگار کراچی میں مقیم جواں سال شاعر کمیل رضوی ہیں کہ جن کے مرثیہ در احوال رسول اکرمؐ کا چہرہ شاملِ مقالہ ہے۔اور منقول بند سے کمیل رضوی صاحب کے اسلوب اور فکر کا ترفع ظاہر ہوتا ہے۔صفحہ ۴۲۵ پر موجود بند ملاحظہ ہو:

نوبت ہے جس کی صورِ سرافیل کون ہے جس کا نشاں ہے اب سرِ میکیل کون ہے
جس کا سلاح دار ہے عزریل کون ہے فرمان دہ ہے حضرتِ جبریل کون ہے
آئین شرع ، کرسی محل ، دیں نظام ہیں
محکوم کس کے حکم کے بارہ امام ہیں

اردو مرثیے میں نعتیہ عناصر کی سیر کے بعد اس انتخاب کا مقصد فقط یہ ہے کہ مرثیے میں موجود نعت کو فقط مسدّس میں کہی گئی نعت نہ سمجھا جائے بلکہ اردو مرثیے میں موجود نعت،عمومی نعت کے لیے نئے آفاق روشن کرنے کا باعث ہے اور زبان و بیان سے لے کر فکری اور فنّی شعور تک یہ نمونہ ہائے کلام قارئین ہی نہیں بلکہ ثنا خوانوں اور نعت گو شعرا کی تہذیبِ ذوق اور شعوری تربیت کرنے کے لیے ایک نصاب کے طور پیش کیے جا سکتے ہیں۔اس مقام پر پروفیسر سید ضمیر حیدر کے حسنِ انتخاب سے جو تعمیری نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں ان کو پیشِ نظر رکھیں تو صرف انتخاب ہی نہیں بلکہ جناب صبیح رحمانی کے الفاظ میں پروفیسر صاحب کا ''شعری ذوق اور انتقادی شعور بھی اس کتاب کی تدوین و تسوید کے ذیل میں تحسین کے لائق ٹھہرتا ہے۔''

سرتاؔج کی مرثیہ نگاری

علی عرفاؔن

''فروغ مرثیہ'' کے پلیٹ فارم سے میں نے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جن میں حیدرآباد دکن کے اُن مرثیہ گوشعرا کا تذکرہ تھا جو ایک رخ سے معروف ہیں اور ایک رُخ سے غیر معروف اس جہت سے کہ دکن کی عزاداری میں ان کا خاطر خواہ حصہ ہے، اور غیر معروف اس جہت سے کہ اب تک کے مرتب کیے گیے تذکروں میں ان کا ذکر بہ حیثیت مرثیہ نگار نہیں ملتا۔ اس ذیل میں اب تک چراغ علی سراجؔ، اوج یعقوبی اور علی جاویدؔ مقصود کے تذکرے ''فروغ مرثیہ'' میں طباعت کی سعادت حاصل کر چکے ہیں اور اب یہ چوتھا تذکرہ ہے، درحالِ میر سعادت علی رضوی سرتاجؔ۔

سرتاؔج کے مختصر حالاتِ زندگی کے لیے میں ان کے فرزند جناب حسن عباس احسنؔ کا ممنون ہوں جو خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں اور انجمنِ پروانۂ شبیرؑ کے صاحب بیاض بھی ہیں۔

سرتاؔج کا سنِ ولادت حتماً معلوم نہ ہوسکا مگر حسن عباس احسنؔ کے مطابق بہ وقت انتقال ان کی عمر ۸۲ یا ۸۳ برس تھی اور ان کی تاریخِ انتقال ۲۳ ستمبر ۱۹۷۴ء تھی۔ اس اعتبار سے ان کا سن ولادت ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء بنتا ہے۔

میر سعادت علی نے جب شاعری شروع کی تو اپنا تخلص صادقؔ رکھا جسے بعد میں سرتاؔج سے تبدیل کر دیا اور اسی تخلص سے مشہور ہوئے۔

جناب میر مہدی علی مسرورؔ سے شرفِ تلمذ رہا۔ ایک مرتبہ سرتاؔج نے ایک سلام کہا جس کی ردیف تھی۔

مسکراہٹ معنی فُزتُ بہ رب الکعبہ ہے
جب یداللّٰہی مصلّے پر ہو اصغرؑ کی نماز

سرتاؔج کے مرثیوں کی تعداد پانچ ہے۔ ان میں سے چار مرثیے ۱۳۵۸ ہجری میں بہ عنوان ''نذرِ حُسین'' طبع ہوئے اور ایک مرثیہ غیر مطبوعہ ہے۔ طبع شدہ مرثیوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱) کس کو کہتا ہے جہاں سروِ گلستانِ حُسینؑ	۱۳ بند	درحالِ امامِ چہارمؑ
۲) غربت میں کس نے کی ہے رفاقت حُسینؑ کی	۲۴ بند	درحالِ زینبؑ کُبریٰ
۳) دربار میں یزید کے آتے ہیں اہلِ بیتؑ	۲۳ بند	درحالِ دربارِ شام
۴) شام میں داخلہ ہے زینبؑ کا	۳۰ بند	درحالِ شام

ان میں سے اول الذکر مرثیہ دکن کے مرثیہ خوانوں میں مقبولِ عام ہے اور شہادتِ امام زین العابدینؑ کی اکثر مجالس میں پڑھا جاتا ہے۔ مگر مرثیہ خوان حضرات اس مرثیے کو اس کے دوسرے بند سے شروع کرتے ہیں۔

جس کا پہلا مصرع ہے۔

شاہِ والا نے شہادت کا سرانجام کیا

پانچواں اور غیر مطبوعہ مرثیہ وداعِ ایامِ عزا سے متعلق ہے اور اس مرثیے میں ۱۵ بند ہیں۔ مرثیے کا پہلا مصرع ہے:

آج سے ختم ہے عزاداری

چاروں مطبوعہ مرثیے اس وقت کے ہیں جب صادق تخلص تھا۔ غیر مطبوعہ مرثیے میں مقطع نہیں ہے۔

سرتاجؔ نے اس دور میں مرثیے کہے ہیں جب دکن میں بینیہ مرثیے مقبول تھے۔ سرتاجؔ کے مرثیوں میں بھی بین کا عنصر غالب ہے مگر ان کے بین میں شورِ طوفان نہیں بلکہ پہاڑی چشموں کی سی روانی ہے۔ ان مرثیوں کے بین میں ایک اور خوبی یہ ہے کہ مصائب فضائل کو اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں۔ مثلاً

شاہؑ والا نے شہادت کا سرانجام کیا   سر کٹا ، ظلم سے حق کا مگر کام کیا
صبر نے عابدؑ بیمار کے اتمام کیا   باپ اور بیٹے نے اسلام کو اسلام کیا
وعدۂ طفلی کا جو شبیرؑ وفا کرتے ہیں
حق یہ فرزندیٔ سرورؐ کا ادا کرتے ہیں

اس ذیل میں ''دربار میں یزید کے آتے ہیں اہلِ بیتؑ'' والے مرثیے کا یہ بند ملاحظہ ہو جس میں سرِ حُسینؑ جناب زینبؑ سے مخاطب ہے

زینبؑ حُسینؑ تم سے بہت شرمسار ہے   پر کیا کرے ، غریب کا کیا اختیار ہے
مشکل میں صبر اہلِ وفا کا شعار ہے   بخشش کا عاصیوں کی تمہی پر مدار ہے
بہنا تمہارے صبر پہ خود مجھ کو ناز ہے
تھامو کہ غرق ہونے کو اب یہ جہاز ہے

میر سعادت علی خاں سرتاجؔ کے مرثیوں میں داخلیت نمایاں ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اے گُل گلشنِ زہرؑا ترے قرباں صدقے   تیرے ایثار و کرم کے شہِؑ ذیشاں صدقے
میرا گھربار مرا مال مری جاں صدقے   کیوں نہ ہو تجھ پہ ہر اک صاحبِ ایماں صدقے
نار سے ہم کو بچانے کی یہ تدبیریں ہیں
لنگرِ کشتیٔ اُمت تری زنجیریں ہیں

یا۔

اولاد والے غور کریں بہرِ کردگار   بچوں سے زندگی کی ہوا کرتی ہے بہار
قربان تیرے صبر کے زہرؑا کی یادگار   بھائی پہ اپنے دونوں پسر کر دیئے نثار
ماتم کیا نہ روئیں نہ غم کا گِلہ کیا
لاشے جب آئے شکر کا سجدہ ادا کیا

دعا بھی داخلیت کی نمائندہ ہوتی ہے اور سرتاجؔ کے چاروں مطبوعہ مرثیے حسبِ ذیل دعا پر اختتام پذیر ہوتے ہیں:

۱)۔

کفر و بدعت پہ ہے مائل یہ زمانہ یارب
تو ہمیں کامل الایمان اُٹھانا یارب

۲)۔

ہے آرزو یہی دلِ عبدِ حقیر میں
شامل ہوں شیعیانِ جنابِ امیرؑ میں

۳)۔

کر حق سے اب دعا کہ یہ ہدیہ قبول ہو
لب پر ہمیشہ مدحتِ آلِ رسولؐ ہو

۴)۔

جب تلک چرخ کا قیام رہے
مدح گوئی سے مجھ کو کام رہے

جب جناب میر مہدی علی شہیدؔ (نواب شہید یار جنگ) کے سلاموں کا مجموعہ بہ عنوان ''صد سلام'' مرتب ہوا تو مقدمہ جناب سعادت علی خاں سرتاجؔ ہی نے تحریر کیا۔

یہ ایک تفصیلی مضمون ہے جو سرتاجؔ کے تبحرِ علمی کا بھی پتہ دیتا ہے۔ اِس مضمون میں ایک جگہ انھوں نے لکھا کہ ''یہ مانی ہوئی بات ہے کہ نظم میں ہو یا نثر میں جملۂ استفہامیہ جملۂ خبریہ سے زیادہ لطف دیتا ہے''۔ سرتاجؔ اس قول پر خود عمل پیرا بھی ہوئے اور اپنے دو مرثیوں کے مطلعے استفہامیہ کہے:

۱) کس کو کہتا ہے جہاں سروِ گلستانِ حُسینؑ — رونقِ دینِ مبیں شمعِ شبستانِ حسینؑ
حاملِ شرعِ نبیؐ یوسفِ کنعانِ حسینؑ — آدمؑ آلِ عبؑا مطلعِ دیوان حسینؑ
جانشینِ شہؑ مظلوم کسے کہتے ہیں
عابد و زاہد و معصوم کسے کہتے ہیں

۲) غربت میں کس نے کی ہے رفاقت حُسینؑ کی — سب سے سوا ہے کسی کو محبت حسینؑ کی
کس کی نظر میں فرض تھی طاعت حسینؑ کی — تکمیل کس سے پائی شہادت حسینؑ کی
ہے کون یادگار علیؑ و بتولؑ کی
وہ کون ذی شرف ہے نواسی رسولؐ کی

سن ۱۹۷۴ء (بہ مطابق ۱۳۹۴ھ) جب جناب میر سعادت علی خاں رضوی سرتاجؔ کا انتقال ہوا تو شاعر ملت جناب باقرؔ رضوی امانت خانی نے تاریخ کہی:

اب وہ ہیں مسرور باغِ خلد میں پیشِ علیؑ
مل چکی بالائے صبر جس کو معراجِ سخن
مسندِ شعر و سخن اب کیوں نہ ہو باقرؔ اداس
اُٹھ گیا دنیا سے زیبِ جاہ، سرتاجِ سخن

۱۹۷۴ء

مرثیہ

سرتاجِ سخن حضرت نواب میر سعادت علی خاں رضوی سرتاجؔ اعلی اللہ مقامہٗ

آج سے ختم ہے عزاداری کل نہ مجلس کی ہوگی تیاری
غم و رنج و الم ہوا تاری (۱) اشک آنکھوں سے ہوگئے جاری

دل سے پیدا یہ بین ہوتے ہیں
ہم سے رُخصت حسینؑ ہوتے ہیں

کوئی مجلس بِنا جو کرتا تھا اُس کو ملتے تھے مرتبے کیا کیا
بنا محسن کہیں رسولِ خدا (۲) آئیں جنّت سے اُس کے گھر زہراؑ

اللہ اللہ کیا عنایت ہے
ایک عاصی کا گھر بھی جنت ہے

ہاتھ میں فاطمہؑ کے ہو رومال آنسو پونچھیں کریں یہ رو کے مقال
یار سب رہیں خوشحال (۳) اور دعا دیں یہ کھولے سر کے بال

نام پر جان کھونے والے ہیں
میرے بچے کے رونے والے ہیں

بارِ الہٰا اِنھیں تو رکھ آباد رہے آباد اِن کی سب اولاد
ایک دُکھیا کا دِل کیا ہے شاد (۴) تو عطا کر اِنھیں بھی دل کی مراد

حق ادا کرتے ہیں محبت میں
ساتھ میرے ہوں یہ بھی جنّت میں

آج ہم مصطفٰےؐ کا پُرسہ دیں حسنؑ مجتبٰی کا پُرسہ دیں
شاہِ موسیٰؑ رضا کا پُرسہ دیں (۵) یا شہِ کربلا کا پُرسہ دیں

دِل کو سیری نہیں جسے روئیں
ایک دن میں کسے کسے روئیں

جتنی توفیق حق نے بخشی تھی ہم غلاموں نے آہ و زاری کی
دل کو پھر بھی نہیں ہوئی سیری (٦) روتے روتے یہ جان ہی جاتی
حاصل اپنا یہ مدعا نہ ہوا
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آپ اَگلے برس تک آئیں گے صفِ ماتم یہاں بچھائیں گے
زندگی جو غلام پائیں گے (۷) پھر یونہیں تعزیے اُٹھائیں گے
سب شہیدوں کا کبریا حافظ
جاؤ سبطِ نبیؐ خدا حافظ

ٹھہرو زہراؑ کے مہ لقا ٹھہرو ٹھہرو یا شاہِ کربلا ٹھہرو
ہم غلاموں کی التجا ٹھہرو (۸) دم نِکل جائیں گے ذرا ٹھہرو
کیا خطا منہ جو موڑے جاتے ہو
کس پہ ہم سب کو چھوڑے جاتے ہو

ٹھہرو ٹھہرو رسولؐ کے جانی کی نہیں ہم نے کچھ بھی مہمانی
پیاس کی ہے تمھیں فراوانی (۹) ٹھنڈا پلائیں ہم پانی
ہے مزا اِس میں آبِ کوثر کا
فاتحہ دے دیا ہے اصغرؑ کا

خیر جانا ہے آپ کو جو شِتاب سُن لو اک عرضِ مجمعِ بے تاب
دو اِجازت اِمامِ عرشِ جناب (۱۰) ہم بھی زینبؑ کی طرح تھامیں رکاب
رو رہیں ہیں ہمیں منا کر جاؤ
جاؤ ہم کو گلے لگا کر جاؤ

جایئے شانِ مرتضیٰؑ حافظ دِل جلی ماں کی ہو دعا حافظ
رہیں اَسرار کِبریا حافظ (۱۱) جایئے جایئے خدا حافظ
دِل نوازی سے کام لو آقا
بیکسوں کا سلام لو آقا

دیکھو روتا ہے آپ کا صادقؔ دردِ فرقت کا مُبتلا صادقؔ
کہہ دو مولاؑ نہ کر بُکا صادقؔ (۱۲) پھر محرم میں آؤں گا صادقؔ
زینبِؑ باوفا بھی آئے گی
میری ماں فاطمہؑ بھی آئے گی

آئیں گے ساتھ ابنِ شبرؑ بھی اور عباسؑ جانِ حیدرؑ بھی
ہونگے مہمان تمہارے اکبرؑ بھی (۱۳) آئیں گے مسکراتے اصغرؑ بھی
ہے یہ وعدہ کہ سب کو لاؤں گا
آؤں گا آؤں گا پھر آؤں گا

شانِ اُلفت دِکھایئے مولا جذبِ دل کو بڑھایئے مولاؑ
کچھ صدا تو سنایئے مولا (۱۴) یوں نہ خاموش جایئے مولا
تم بھی کہہ دو کہ کبریا حافظ
رونے والوں میرے خدا حافظ

آج کل تم بہت پریشاں ہو خوف مَت کھاؤ اہلِ ایماں ہو
جنگ ہو یا بَلا ہو طُوفاں ہو (۱۵) کس لیے اِس قدر ہراساں ہو
یہی آہ و بُکا بچا لے گی
میری ماں کی دُعا بچا لے گی

دبیرؔ کے مرثیے
(جلد اوّل)
(شائع ہو چکی ہے)
ترتیب وتدوین
اصغر مہدی اشعر

دبیرؔ کے مرثیے
(جلد دوم)
(شائع ہو چکی ہے)
ترتیب وتدوین
اصغر مہدی اشعر

دبیرؔ کے مرثیے
(جلد سوم)
(شائع ہو چکی ہے)
ترتیب وتدوین
اصغر مہدی اشعر

غیر مطبوعہ مرثیہ

درحالِ امام رضا علیہ السلام

شگفتہ دلشادؔ

رُخصت جہاں سے جبکہ امامِ رضاؑ ہوئے ہم سے جُدا لو آج امامِؑ ہُدیٰ ہوئے
عالم میں سوگوار یُوں اَہلِ عزا ہوئے نوحہ کناں نجف میں وَلیِ خُدا ہوئے
ماتم بپا ہے گریہ کُناں یہ فضائیں ہیں
وا غُربتا کی درد میں ڈُوبی صدائیں ہیں

زہرِ دغا سے زرد یہ چہرہ تمام ہے سم کے اثر سے کرب میں میرا امامؑ ہے
ٹکڑے جگر ہے درد میں عالی مقام ہے سجدے میں سر لبوں پہ خُدا کا کلام ہے
اللہ حق کے مونس و یاور کی خیر ہو
کاظمؑ کے نور عین دلاور کی خیر ہو

ہمشیر ہے سفر میں قضا تُو ذرا ٹھہر بے چین ہیں امامِ رضاؑ تُو ذرا ٹھہر
مُدّت ہوئی بہن ہے جُدا تُو ذرا ٹھہر بیمار ہے وہ بہرِ خُدا تُو ذرا ٹھہر
بھائی کے واسطے یہ بہن دل ملول ہے
تنہا سفر میں اَے خُدا بِنتِ رسولؐ ہے

جس کی وجہ سے دِینِ خُدا کو بقا مِلی اُمّت سے اُسکو آج یہ کیسی سزا ملی
مظلومیت یہ ہے کہ بے جرم و خطا مِلی غُربت کی اِنتہا کہ کبھی نہ وفا مِلی
اُمّت نے مار ڈالا ہے کاظمؑ کے لال کو
صدمہ مِلا ہے پھر سے محمدؐ کی آل کو

وقتِ نزع ملے جو تقیؑ بابا جان سے بولے رضا گُزر گیا میں اِمتحان سے
بچھڑے تقیؑ ہیں آج لو اِک مہربان سے رُخصت ہوئے اِمامِ رضاؑ اِس جہان سے
ماتم جہاں میں آج غریبِ وطن کا ہے
نوحہ لبوں پہ اُجڑے ہوئے اِک چمن کا ہے

❀❀❀

ایڈیٹر کے نام خط

پروفیسر ناشر نقوی (امروہہ، انڈیا)

برادرم اشعر صاحب واجبات!

فروغِ مرثیہ کے لیے آپ اپنے ادارے اور رسالے سے جو خدمتِ علم اور خدمتِ دین کر رہے ہیں وہ قوم اور زبان و ادب کے لیے ایک بڑا کارنامہ ہے۔فروغِ مرثیہ کا تیرھواں شمارہ باصرہ نواز ہوا اس کی جو دس کاپیاں آپ نے مجھے بھیجیں ان میں سے نو کاپیاں میں نے شہرِ امروہہ کے اہلِ مرثیہ میں تقسیم کر دیں۔تمام حضرات نے اِس شمارے کے مشمولات کی پذیرائی کی ہے۔چھنّو لال دلگیرؔ کا تعارف آپ نے خوب دیا ہے، ہمارے امروہہ میں یہ واحد شاعر ہے جس کا مرثیہ ''قید سے چھوٹ کے جب سیّدِ سجادؑ آئے''، شہر میں چہلم کے موقع پر ہر گھر اور ہر در پر پڑھا جاتا ہے۔شہر کے کچھ ہندو گھروں میں بھی اس کی سوزخوانی ہوتی ہے۔اس کے طرز کی یہ انفرادیت ہے کہ مرثیہ بیٹھ کر نہیں کھڑے ہو کر پڑھا جاتا ہے۔

دلگیرؔ کا یہ مرثیہ ایک چشم دید مردِ دہقاں کی زبان سے کمنٹری کے طرز میں ہے جو ابھی تک کے مرثیوں میں بیانیہ کی واحد مثال ہے۔

مذکورہ شمارے میں طالب جوہری اور بنگال کی مرثیہ نگاری پر عمدہ مضامین ہیں۔جاوید حسن کا نیا مرثیہ بہت عمدہ ہے۔آپ نے میرے نئے مرثیے کو بھی شامل اشاعت کیا۔اِس کے لیے بہت بہت شکریہ۔دعا ہے کہ فروغِ مرثیہ کے لیے ہم سب ٹیم ورک کے طور پر خدمت انجام دیتے رہیں۔ہلال نقوی کی مرثیہ نگاری پر بھی اچھا مضمون پڑھنے کو ملا۔علی عرفان کا مرثیہ بھی لائقِ ستائش ہے۔

پروفیسر ناشر نقوی۔۔(امروہہ۔انڈیا)

فدا محمد ناشاد (اسکردو، پاکستان)

عزت مآب جناب اصغر مہدی اشعر صاحب دام عزہ العالی۔

السلام علیکم۔۔۔۔۔!1444ھ

عیدِ غدیر کی مناسبت سے پیشگی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔یکے بعد دیگرے ''فروغ مرثیہ'' کے متعدد شمارے برادر گرامی قدر بشارت حسین کی وساطت سے مجھ تک پہنچتے رہے ہیں۔آپکی ان کاوشوں کو جس قدر خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔فروغ مرثیہ کے حوالے سے مجھ جیسے نو آموز مشق سخن کرنے والوں کے کلام بھی بین الاقوامی سطح پر صاحبان شعر و سخن اور اہل دانش و بینش تک پہنچانے کی جو ذمہ داری آپ نے لی ہوئی ہے نہایت ہی قابلِ ستائش اور اپنی مثال آپ ہے۔میری دعا ہے، آپ کی یہ خدمت بارگاہ اہلبیت اطہار میں شرفِ قبولیت حاصل کرے، آمین! حقیر کا ایک مرثیہ ''سفر امام حسینؑ مدینہ تا کربلا'' میری کتاب موسومہ ''متاعِ فکر'' میں شائع ہو چکا ہے۔اسی تسلسل میں غیر مطبوعہ مرثیہ ''شہادت امام حسینؑ'' فروغ مرثیہ کے آٹھویں شمارے میں شائع ہو چکا ہے، جو بہت سے دوستوں اور عزادارانِ اہلبیت کی جانب سے میری حوصلہ افزائی کا باعث بنا۔اس خط کے ساتھ ''اسیریٔ اہلبیت از کربلا تا شام'' کے عنوان سے ایک غیر مطبوعہ مرثیہ ارسال ہے۔اسے بھی اگر ''فروغ مرثیہ'' کے محرم نمبر میں نوک پلک درست فرماتے ہوئے شایع فرما کر ممنون فرمائیں۔اللہ توفیق دے تو ''شام تا مدینہ'' ''اہلبیت اطہارؑ کی واپسی'' کا مرثیہ بھی لکھنے کی کوشش کروں گا۔تا کہ ان چاروں کے تسلسل سے ''سفر اہلبیتؑ، مرثیہ مدینہ تا مدینہ'' مکمل کتابی صورت میں منظر عام پر لاسکوں۔التماس دعا، والسلام۔۔۔۔۔!

حقیر فدا محمد ناشاد۔۔(اسکردو، پاکستان)